دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۲ ماہ ذوالحجہ ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۱۳ء عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

مغربی یوپی کے وہ علاقے جو گذشتہ دنوں یک طرفہ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جل کے خاکستر ہو چکے ہیں وہاں اوران کے آس پاس متعدد ایسی بستیاں آباد ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کی دینی، علمی اور تہذیبی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ اسی نواح میں نانوتہ، تھانہ بھون، شاملی، کیرانہ، کاندھلہ، کلیر اور گنگوہ کی بستیاں ہیں۔ یہاں سے کیسے کیسے علماء، فضلاء اور صلحاء اٹھے۔ دین اور علوم دین کی حفاظت، توسیع اور اشاعت کے میدان میں ان بزرگوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اس لائق ہیں کہ انہیں آب زر سے لکھا جائے۔ قریب ہی مظاہر العلوم اور دارالعلوم کے تاریخ ساز ادارے ہیں۔ کون سوچ سکتا تھا کہ یہ زمین ایک دن مسلمانوں کے لیے تنگ ہوجائے گی۔ خاص طور سے اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس خطہ سے مسلمانوں کا تعلق بہت پرانا ہے اور وہ یہاں صدیوں سے برادران وطن کے ساتھ مل جل کے امن وآشتی کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ دونوں نے کندھے سے کندھا ملا کر برٹش سامراج کا مقابلہ کیا اور اس راہ میں بڑی قربانیاں دیں۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں اس خطہ کے علماء اور مشائخ کا کردار بڑا تابناک رہا ہے۔ اس کے علاوہ مدتوں ساتھ رہنے بسنے کی وجہ سے آپسی تعلقات میں ایک خاص طرح کی یگانگت پیدا ہوگئی تھی اور ایک دوسرے کے لیے دونوں کا وجود ناگزیر سا ہو گیا تھا۔ سیاسی معاملات میں بھی عام طور پر جاٹوں کا اتحاد مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس علاقہ کے بہت سے مسلمان اور جاٹ ایک ہی نسلی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اب اس کی حیثیت ایک بھولی بسری یاد سے زیادہ نہیں رہ گئی۔ اس سے پہلے بھی اس باہمی یگانگت اور ہم آہنگی کو پارہ پارہ کرنے کی کوششیں ہوئیں لیکن کامیاب نہیں ہوسکیں۔ تقسیم ملک کے ہیجان انگیز دور میں بھی یہ علاقہ بڑی حد تک پرسکون ہی رہا۔ البتہ ۱۹۴۸ میں اس علاقہ کو فرقہ وارانہ منافرت کی آگ میں جھونک دینے اور یہاں سے مسلمانوں کی نسلی تطہیر کی ایک خوفناک اور منصوبہ بند کوشش آر ایس ایس کے سربراہ گروگولوالکر کی ذاتی نگرانی میں کی گئی جو چند دیانتدار افسروں کی فرض شناسی کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی۔ مکمل ثبوت اور پختہ شواہد کے باوجود اس وقت کی کانگریس حکومت نے مجرمین کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ ایسے سنگین معاملات میں بھی مجرمانہ جانبداری اور چشم پوشی کی روایت نئی نہیں ہے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل یوپی کے پہلے ہوم سکریٹری راجیشور دیال نے اپنی کتاب A Life of Our Times میں محفوظ کردی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آر ایس ایس کبھی بھی اس منصوبہ سے دست بردار نہیں ہوئی اور بالآخر وہ اس علاقہ میں آگ اور خون کا کھیل کھیلنے میں کامیاب ہوگئی جو اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ کھیل ہے۔ اپنے ناپاک مقاصد میں ان کو یہ کامیابی اس وقت ملی جب گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی کا وسیع تجربہ رکھنے والے

نریندر مودی بی۔جی۔پی میں مرکزی کردار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے اور ان کے سزا یافتہ دست راست امت شاہ کو یوپی کا چارج دیا گیا۔ یوپی میں گجرات ماڈل کے نفاذ کے لیے مغربی یوپی کا انتخاب کیا گیا اور وہاں وہ سب کیا گیا جو گجرات میں کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ فرقہ وارانہ فساد نہیں تھا بلکہ جاٹوں کا مسلمانوں کے خلاف یک طرفہ تشدد تھا، ایسا تشدد جو تمام حدوں کو پار کر گیا۔ سوشل میڈیا نے اس آگ کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ دفعہ ۱۴۴ کے باوجود ایک کے بعد ایک مہا پنچایت کا انعقاد ہوتا رہا اور بڑی تعداد میں لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں کسی غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود پولیس اور انتظامیہ خاموش تماشائی بنی رہی اور لکھنؤ اور دہلی میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ کتنی بستیاں، کتنی املاک اور کتنے مکانات راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیے گئے۔ مقتولین کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ کتنے ہی لوگوں کو ان کے مکانات میں زندہ جلا دیا گیا یا قتل کر کے آگ میں پھینک دیا گیا۔ ایک بڑی تعداد کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور ان کی اکثریت اب اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ خواتین کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ حد بیان سے باہر ہے۔ دہلی آبرو ریزی کے واقعہ کے بعد جو عوامی غم و غصہ اور خواتین تنظیموں کی بھاگ دوڑ نظر آئی تھی اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔

بی۔جی۔پی کی سیاست مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت کی اساس پر قائم ہے۔ البتہ سماج وادی پارٹی کا طرز عمل ناقابل فہم ہے۔ مظفر نگر میں جو کچھ ہوا وہ اچانک نہیں تھا۔ یہ بآسانی محسوس کیا جا سکتا تھا کہ حالات جس رخ پر جارہے ہیں بالآخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے باوجود بھی حکومت خاموش رہی اور مغربی یوپی کے مسلمانوں کے سر سے قیامت گذر گئی۔ صوبہ میں وقوع پذیر ہونے والے مسلسل فسادات اور اب مظفر نگر میں رونما ہونے والے تشدد کی وجہ سے سماج وادی پارٹی پر مسلمانوں کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا ہے۔ اگر اس کو بحال کرنے کے لیے فوری اور موثر اقدامات نہ کیے گئے تو اس کی تلافی ناممکن ہو جائے گی اور صوبہ کی سیاست پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔ کانگریس کی طرف سے ان فسادات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا۔ پارٹی کے تمام بڑے لیڈروں نے وہاں کا دورہ کیا لیکن اس سنگین مسئلہ کے مستقل اور پائدار حل کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انسداد فرقہ پسندی مسودہ قانون جس سے کافی حد تک اس صورت حال کا تدارک کیا جا سکتا ہے اور جس کا وعدہ مدت سے کیا جارہا ہے اس کے بارے میں مکمل خاموشی ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ یہ بل بغیر کسی تاخیر کے پاس کیا جائے۔

پروفیسر شعیب اعظمی ۲۸ ستمبر کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ ان کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ ان کے والد حکیم محمد اسحاق صاحب ایک کامیاب طبیب کے علاوہ تحریک آزادی کے ایک اہم اور سرگرم

کارکن تھے۔ دارالمصنّفین سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ سیاسی معاملات میں اتحاد مذاق کی وجہ سے یہ تعلقات مزید پختہ ہوگئے تھے۔ شعیب اعظمی صاحب کی پیدائش ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ بچپن ہی میں ایک حادثہ میں ایک پیر شدید طور پر متاثر ہوگیا تھا۔ اس کا اثر ان کی ابتدائی تعلیم پر پڑا لیکن انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا اور اپنی کوشش اور جدو جہد سے اپنے لیے ایک نمایاں مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ مدرسہ اسلامیہ میں ابتدائی اردو اور فارسی تعلیم کے علاوہ قرآن مجید حفظ کیا۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کیے۔ ۱۹۵۵ء میں شبلی نیشنل کالج سے بی۔اے کیا۔ ۱۹۵۷ء میں آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے اور ۱۹۵۹ء میں جامعہ ملیہ سے بی۔ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔ اس کے بعد کئی سال تک انجمن اسلام ہائی اسکول، ممبئ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۶ء میں فارسی میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد وہ دہلی منتقل ہوگئے اور کئی سال تک دہلی ایڈمنسٹریشن میں ملازمت کرتے رہے اور ساتھ ہی فارسی زبان وادب میں پی۔ایچ۔ڈی کے لیے کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۲ء میں دہلی یونیورسٹی سے 'فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد بحیثیت لکچرر ان کا تقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہوگیا جہاں وہ پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ زندگی بھر قرطاس وقلم سے رشتہ استوار رہا۔ ابتداء میں کہانیاں اور مختلف النوع موضوعات پر مضامین لکھتے رہے۔ جب فارسی زبان وادب سے دلچسپی پیدا ہوئی تو اسی کے ہو رہے۔ ان کے بیشتر علمی اور تحقیقی نگارشات فارسی زبان وادب اور اس کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ انہوں نے اپنے وطن اعظم گڑھ کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت پر 'پروانہ چراغ مزار خودیم ما' کے نام سے ایک بڑا خوبصورت مرقع لکھا ہے۔ اس کے اندر آزادی سے پہلے کے اعظم گڑھ کی ایک جیتی جاگتی تصویر آگئی ہے۔ اس کے علاوہ جنگ آزادی میں اعظم گڑھ کے مسلمانوں اور شبلی اکیڈمی کی خدمات کے لیے اسے ایک اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی دوسری کتابوں میں ایران کا سفرنامہ 'صحبت یار آخر شد'، 'بطواف کعبہ رفتم'، 'فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق'، 'قصہ ہای رنگ رنگ'، 'کوراوغلو'، 'عہد حاضر کی دری شاعری' اور 'گاہے گاہے باز خواں' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر بڑی تعداد میں مقالے سپرد قلم کیے۔ شرافت، وضعداری، نرم گفتاری اور خوش خلقی ان کی شخصیت کے نمایاں عناصر تھے۔ علی گڑھ آتے رہتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی بڑی محبت سے پیش آتے۔ بڑی خواہش تھی کہ کسی موقع سے دارالمصنّفین آئیں جس سے ان کو بڑا تعلق خاطر تھا لیکن ان کی کمزور صحت کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔ فارسی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے علمی حلقوں میں خاص طور سے ان کی کمی بہت محسوس کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے۔ آمین

مقالات

غبار خاطر میں عربی اشعار۔تصحیح و تخریج کے مسائل

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد ہندوستان میں ان کی تصنیفات کو جدید انداز میں مرتب اور شائع کرنے کا بیڑا ساہتیہ اکادمی نے اٹھایا، اور ترتیب و تحشیہ کا کام مالک رام نے انجام دیا۔غبار خاطر کا پہلا اڈیشن مالک رام کا مرتبہ ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا۔ بعد میں انہوں نے اس پر نظر ثانی کی اور ترمیم واضافہ کے بعد نیا اڈیشن ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔تب سے اسی کا عکس چھپ رہا ہے۔میرے سامنے جو اڈیشن ہے وہ ۲۰۰۸ء کا چھپا ہوا ہے۔

مالک رام کے اڈیشن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے حواشی ہیں جو سو صفحات سے زیادہ پر محیط ہیں۔غبار خاطر میں جن اشخاص اور مقامات کا ذکر آیا ہے ان حواشی میں ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔آیات، احادیث اور دوسرے اقتباسات کے حوالے فراہم کیے گئے ہیں، بعض آیات کے ترجمے بھی درج کیے گئے ہیں۔لیکن سب سے مشکل کام اردو، فارسی اور عربی اشعار کی تخریج کا تھا۔مرتب کے بقول اس کتاب میں کوئی سات سو اشعار ہیں۔ظاہر ہے انہیں شعراء کے دواوین اور تذکروں میں تلاش کرنا خصوصاً جب کہ بہت سے اشعار کے بارے میں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان کا قائل کون ہے، سخت جانفشانی اور عرق ریزی کا طالب تھا۔تاہم مرتب اپنی کوشش اور دوستوں کے تعاون سے اس مہم کو سر کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئے۔

راقم سطور نے غبار خاطر زمانۂ طالب علمی میں پڑھی تھی۔ جون ۱۹۴۷ء کا اڈیشن تھا اور ناشر کی حیثیت سے اس پر ''میری لائبریری لاہور نمبر ۸'' درج تھا۔اس کے بعد کبھی کبھار تفریح طبع

ریاض۔سعودی عرب

کے لیے جستہ جستہ دیکھنے کا اتفاق تو ہوا لیکن مکمل کتاب دوبارہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔

چند سال قبل مولانا آزاد کی تحریریں ازسرنو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو غبار خاطر کا ایک نسخہ مرتبہ مالک رام اپنے ساتھ یہاں ریاض لایا۔ مطالعے کے دوران نظر آیا کہ عربی کے کئی اشعار بلا حوالہ رہ گئے ہیں اور بعض کے قائل معلوم نہ ہو سکے۔ اسی طرح بعض کی خواندگی درست نہیں اور بعض کی تخریج نامکمل ہے۔ چنانچہ خیال ہوا کہ اس اڈیشن میں عربی اشعار کی تصحیح و تخریج میں جو خامیاں رہ گئی ہیں، ایک مضمون میں اگر ان کی اصلاح کر دی جائے تو یہ غبار خاطر کی بھی خدمت ہوگی اور اس مقبول عام اڈیشن سے استفادہ کرنے والوں کی بھی۔

مالک رام نے جیسا کہ اوپر گزرا اس اڈیشن پر ۱۹۸۲ء میں نظر ثانی کی تھی۔ اس کے بعد سے عربی زبان میں ادب، تاریخ اور تذکرے کے کتنے ہی مآخذ جو قلمی صورت میں تھے، زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ نیز تلاش و تفحص کے جو وسائل آج میسر ہیں، وہ کچھ دنوں قبل تک ناپید تھے۔ اس لیے یہ کام پہلے کی بہ نسبت اب زیادہ سہولت اور خوبی سے انجام دیا جا سکتا ہے، لیکن درمیان میں ایک الجھن ایسی پیش آئی کہ یہ کام ملتوی ہوتا رہا۔

غبار خاطر میں عربی کے بعض اشعار ساقط الوزن چھپے ہیں، اور ایسا نہیں ہے کہ ان میں کوئی دقیق فنی سقم ہو جس کے انکشاف کے لیے فن عروض کا ماہر ہونا ضروری ہو۔ بلکہ الفاظ کی کمی بیشی کی وجہ سے شعر کے متن میں جو گڑبڑی پیدا ہوئی ہے اسے ہر صاحب ذوق اور موزوں طبع اول وہلہ میں محسوس کر سکتا ہے۔ مالک رام کی عربی دانی کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں۔ عربی اشعار کی تخریج میں جن دوستوں (یا دوستوں کے تلامذہ) نے ان کی مدد کی ان کے نام بھی مقدمے میں مذکور نہیں اس لیے ان کے بارے میں بھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مرتب اور ان کے معاونین کو ان اشعار کے ناموزوں ہونے کا احساس بہر حال نہیں ہوا، اور یہ چنداں حیرت کی بات نہیں، کہ عربی زبان کے کئی اساتذہ کو، مدارس میں بھی اور جامعات میں بھی، برسوں درس و تدریس سے اشتغال رکھنے کے باوجود شعر کو نثر کی طرح پڑھتے دیکھا۔ البتہ تعجب اس پر ہوا کہ یہ اشعار ایسے نہیں تھے کہ مآخذ میں مل نہ سکے ہوں، بلکہ بعض کے قائل معروف اور صاحب دیوان شاعر تھے اور حواشی میں جن مآخذ کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں ان اشعار کا متن

بھی صحیح صورت میں موجود تھا، پھر بھی دوسرے مقامات کے برخلاف جہاں الفاظ کے معمولی فرق کی نشان دہی کی گئی ہے، یہاں متن میں واضح خلل اور الفاظ کی کمی بیشی کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تخریج کا یہ کام ایک سے زیادہ صاحبوں نے انجام دیا تھا اور ہر شخص کا اپنا نہج تھا (یا سرے سے کوئی نہج نہیں تھا) اس لیے یہ اختلاف پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ اس کی مثالیں فارسی اشعار کی تخریج اور اشخاص کے تعارف میں بھی ملتی ہیں جن کے ذکر کا یہ محل نہیں، لیکن بنیادی سوال میرے سامنے یہ تھا کہ مذکورہ عربی اشعار میں جو فاش غلطیاں ہیں وہ مالک رام کے اڈیشن کی ہیں یا سابقہ اشاعتوں سے منتقل آئی ہیں؟

غبار خاطر کا پہلا اڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی جانب سے مئی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا اڈیشن اسی سال اگست میں نکلا۔ مولانا آزاد ان دونوں اشاعتوں سے مطمئن نہیں تھے، کتابت وطباعت بھی خاطر خواہ نہیں تھی، چنانچہ فروری ۱۹۴۷ء میں تیسرا اڈیشن خاص اہتمام سے مکتبہ احرار لاہور نے شائع کیا۔ مالک رام نے اپنے اڈیشن کی بنیاد اسی تیسری اشاعت پر رکھی ہے چنانچہ راقم نے اس کی جستجو شروع کی۔ لیکن ہندوستان کے کتب خانوں سے دور سعودی عرب میں قیام کی وجہ سے اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ۱۲ جولائی ۲۰۱۱ء کو رضا لائبریری رامپور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں حالی پبلشنگ ہاؤس کا ایک اڈیشن نظر آیا مگر مطلوبہ تیسرا اڈیشن وہاں بھی نہ مل سکا۔

خوش قسمتی سے گزشتہ جون میں محبی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور برادرم افضال عثمانی کی عنایت سے مطلوبہ تیسری اشاعت کا ایک پی ڈی ایف نسخہ دستیاب ہوگیا تو اس مضمون کو مرتب کرنے میں اب کوئی مانع باقی نہیں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نسخہ پاکر جس قدر مسرت ہوئی بعد میں وہ اسی قدر حیرانی اور مزید الجھنوں کا باعث بنا۔ ہوا یہ کہ میں نے مالک رام کے اڈیشن کا اس اشاعت سے مقابلہ کرڈالا، اور اس کا جو نتیجہ سامنے آیا وہ بیشتر ناظرین کے لیے خلاف توقع ہوگا۔ ثابت یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء کی طبع ثالث کا متن آج بھی مالک رام کے مرتبہ اڈیشن سے زیادہ مستند ہے۔ الفاظ تو الفاظ، ایک پوری سطر جو طبع ثالث میں موجود ہے، مالک رام کے اڈیشن سے کم از کم ۱۹۸۳ء سے (اور بہت ممکن ہے ۱۹۶۷ء سے) اب تک ساقط چلی آرہی ہے۔

جہاں تک زیر بحث عربی اشعار کا تعلق ہے، یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک شعر کے سوا جس میں مالک رام کے اڈیشن میں غلطی سے ایک لفظ چھپنے سے رہ گیا ہے، ساری غلطیاں طبع ثالث میں بھی اسی طرح موجود ہیں، اب رضا لائبریری رامپور کے اسسٹنٹ لائبریرین ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی سے رابطہ کیا کہ وہ حالی پبلشنگ ہاؤس کے مطبوعہ اڈیشن میں دیکھیں، (یہ غبار خاطر کا پہلا اڈیشن ہے، اس کا سراغ چند روز قبل یوں ملا کہ رضا لائبریری کے رجسٹر میں اس کا اندراج ۲۹ مئی ۱۹۴۶ء کو ہوا ہے، اور یہ اڈیشن مئی ہی میں نکلا تھا۔ کتاب کے شروع میں اڈیشن کی کوئی صراحت نہیں ہے) انہوں نے اطلاع دی کہ اس میں بھی ان اشعار کا متن طبع ثالث کی طرح ہے، گویا یہ غلطیاں شروع ہی سے چلی آرہی ہیں۔

غبار خاطر میں فارسی اشعار کثیر تعداد میں ہیں اور بہت سے اشعار کا متن دواوین اور تذکروں کے مطابق نہیں ہے۔ اس اختلاف کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

> ''تاہم یہ ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اسے جوں کا توں محفوظ نہ رکھا ہو۔ اس صورت میں انہوں نے اس میں ایک آدھ لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے لکھ دیا۔ چونکہ خود موزوں طبع تھے، شعر ساقط الوزن تو ہو نہیں سکتا تھا، البتہ اصل متن قائم نہ رہا'' (مقدمہ ص ۲۴)۔

فارسی کے مقابلے میں عربی کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے، تاہم مالک رام نے مولانا کے موزوں طبع ہونے کی جو بات لکھی ہے وہ صرف اردو فارسی کے ساتھ خاص نہیں ہوسکتی۔ یہ بات عربی پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح اردو فارسی پر، مولانا عربی زبان کے عالم تھے اور جیسا کہ خود انہوں نے لکھا ہے عربی موسیقی میں بھی انہیں دخل تھا۔ مشہور مصری مغنیہ ام کلثوم کے بے شمار اناشید انہوں نے سنے تھے۔ سوال یہ ہے کہ پھر ایسا کیوں ہوا کہ اردو فارسی کے سیکڑوں اشعار میں سے ایک شعر بھی غبار خاطر کی ان اشاعتوں میں ساقط الوزن نہیں چھپا اور یہ مشکل صرف عربی اشعار میں پیش آئی؟ یہی نہیں بلکہ عربی کے بعض اقوال و امثال کے متن میں بھی غلطیاں ہیں اور یہاں بھی محض لفظوں کا تفاوت نہیں ہے بلکہ قواعد کی فاش غلطیاں ہیں، اور تعجب یہ ہے کہ یہ بھی حالی پبلشنگ ہاؤس کی طبع اول سے چلی آرہی ہیں!

جس طرح یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ غلطیاں خود مولانا آزاد کے مسودے میں تھیں، اس طرح بعض غلطیوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کا قصوروار کاتب کو ٹھہرانا بھی مشکل ہے، لیکن بالفرض یہ غلطیاں کاتب ہی نے کی تھیں تو مولانا کی حیات میں تین تین اشاعتیں تصحیح کی چھلنی سے یوں کس طرح گزر گئیں؟

طبع ثالث میں جو میرے سامنے ہے، آیات اور احادیث کی طرح عربی کے اشعار و اقوال بھی خط نسخ میں لکھے ہوئے ہیں، اس وجہ سے نمایاں ہیں اور ان پر نگاہ فوراً پڑتی ہے۔ اس کے باوجود دوسرے مصححین کی طرح (جو شاید عربی سے واقف نہ رہے ہوں) مولوی محمد اجمل خان اور خود مولانا آزاد کی نظر میں کیونکر نہیں آئے!

ایسا بھی نہیں تھا کہ مولانا آزاد غبار خاطر کے متن کی صحت اور اعلیٰ طباعت سے کسی درجے میں غافل رہے ہوں۔ اس کے برعکس غلام رسول مہر کے نام مولانا کے خطوط سے اس باب میں ان کے غایت درجہ اہتمام اور فکرمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ پہلی اشاعت کے بارے میں ۱۷ مارچ ۱۹۴۶ء کو اپنے طویل خط میں لکھتے ہیں:

> ''غلط نامہ آپ کو بھیج چکا ہوں۔ اس کے آخر میں اغلاط مندرجہ صدر کا بھی اضافہ کر دیجیے، اس میں تغافل نہ ہو''۔

اس کے دوسرے ہی روز ۱۸ مارچ کے خط میں غلط نامے کے سلسلے میں دوبارہ یاددہانی کراتے ہیں۔ چند روز بعد ۲۲ مارچ کو پروف میں ایک اور غلطی نظر آتی ہے تو اس کی تصحیح کے لیے لکھتے ہیں۔ اسی طرح ایک خط میں پروف ریڈنگ کا صحیح طریقہ بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو نقش آزاد (ص ۱۹۷-۲۰۳)

اب خاص طبع ثالث کے بارے میں مولانا کا ایک خط ملاحظہ ہو جو ۹ فروری ۱۹۴۷ کو مہر صاحب کے نام لکھا گیا، فرماتے ہیں:

> ''غبار خاطر کے نئے اڈیشن کی تصحیح میں آپ نے بھی حصہ لیا تھا اور میں اس طرف سے بالکل مطمئن تھا لیکن بعض مقامات پر نظر پڑ گئی تو معلوم ہوا کہ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً ''طائرۃ'' کو ظالم کاتب نے ''طاہرۃ'' بنادیا ہے۔ بہرحال

ان اغلاط سے طبیعت زیادہ کوفت نہیں ہوئی لیکن اس وقت ایک صاحب نے دکھایا کہ عید اضحیٰ کو عید الضحی کر دیا ہے۔ یہ غلطی نا قابل برداشت ہے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ غلط نامہ کتاب کے ساتھ شامل کیا جائے۔ معلوم نہیں کتنے نسخے نکل چکے ہیں۔ بہر حال کل بھیجوں گا''۔

دوسری غلطی پر مکتوب الیہ نے یہ نوٹ لکھا ہے:

''یہ غلطی واقعی نا قابل برداشت تھی، کاپی دیکھتے وقت درست کر دی گئی تھی لیکن کاتب نے تصحیح نہ کی۔ اسے یقین تھا کہ صحیح وہی ہے جو اس کے قلم سے نکلا ہے''۔ (نقش آزاد: ۲۱۰)

اوپر عربی اشعار وامثال کی جن غلطیوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور جن پر آئندہ صفحات میں گفتگو ہوگی ان سب کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے جسے مولانا آزاد نے ''نا قابل برداشت'' کہا ہے، اور یہ غبار خاطر کی طبع اول اور طبع ثالث دونوں میں موجود ہیں۔ کیا یہ غلطیاں اس غلط نامے میں شامل تھیں جس کا ذکر مندرجہ بالا مکتوب گرامی میں آیا ہے؟ اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ راقم الحروف تو یہ بھی معلوم نہ کر سکا کہ مولانا نے دوسرے روز حسب وعدہ یہ غلط نامہ غلام رسول مہر کو بھیجا تھا یا نہیں؟ اور اگر بھیجا تھا تو وہ کتاب کے باقی ماندہ مطبوعہ نسخوں میں شامل کیا گیا یا نہیں؟ مہر صاحب نے اس سلسلے میں کوئی نوٹ نہیں لکھا۔ نقش آزاد میں اس تاریخ کے بعد جو خطوط ہیں ان میں غلط نامے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ میرے سامنے طبع ثالث کا جو نسخہ ہے وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو بطور ہدیہ بھیجا گیا تھا اور مولانا آزاد نے اس پر اپنے قلم سے دستخط کے بعد ۲۸ جنوری ۱۹۴۷ء کی تاریخ رقم فرمائی ہے، جب کہ مذکورہ بالا مکتوب اس تاریخ کے بارہ روز بعد لکھا گیا ہے اس لیے اس نسخے میں غلط نامہ شامل ہونے کا امکان نہیں۔ مالک رام نے بھی اپنے مقدمے اور حواشی میں کسی غلط نامے کا ذکر نہیں کیا اور پہلی غلطی ''طائرہ'' کی تصحیح نقش آزاد کے اسی خط کے حوالے سے کی، البتہ دوسری ''نا قابل برداشت'' غلطی کی تصحیح میں اس خط کی جانب کوئی اشارہ نہ کر کے اس کا سہرا اپنے سر لیا!

اعراب (اردو کی اصطلاح کے مطابق جس میں ''تشکیل'' یا ''ضبط'' بھی شامل ہے) لفظ

اور ترکیب کا حصہ ہوتا ہے اور اس کی غلطی سے متن غلط ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی عربی جملے کو پڑھنے یا لکھنے میں فاعل کو منصوب اور مفعول بہ کو مرفوع کر دیں تو جملے کا مفہوم الٹ جائے گا۔ اسی طرح لفظ مطّلب (جیسا کہ عبدالمطلب میں ہے) کو مطلب (مقصد اور منشا کے معنی میں) بنادیں تو مفہوم بھی خبط ہوگا اور اگر شعر میں آیا ہے تو وہ وزن سے بھی خارج ہو جائے گا۔ طبع ثالث میں عربی اشعار اعراب کے بغیر لکھے گئے تھے۔ مالک رام نے نہ جانے کیوں کچھ اشعار میں اعراب لگانے کا تکلف کیا لیکن اس میں بھی کسی اصول کی پابندی نہیں کی اور تصحیح کا اہتمام بھی نہ کر سکے۔ چنانچہ اگر بعض اشعار میں برمحل اور درست اعراب لگائے تو کئی اشعار میں ایسی فاش غلطیاں پائی جاتی ہیں جن سے شعر بے معنی بھی ہوا اور بے وزن بھی۔ اس مضمون میں اعراب کی عام غلطیوں کی تصحیح نہیں کی گئی ہے، البتہ کسی شعر میں کوئی بڑی غلطی ہے جس سے معنی اور وزن میں خلل پیدا ہوا ہے تو اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ بعض مثالیں ضمناً بھی آ گئی ہیں۔

طبع ثالث میں آیات کی تصحیح کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ مالک رام کے اڈیشن میں بھی یہ اہتمام فی الجملہ موجود ہے، لیکن سورہ نازعات کی ایک آیت میں "لم یلبثوا" (کسر باء کے ساتھ) اب تک غلط چھپتا آرہا ہے۔ یہ غلطی متن (ص ۲۴۹) اور اشاریے (ص ۴۲۲) دونوں جگہ ہے۔ اسی طرح سورہ اعراف کی ایک آیت میں متن (ص ۲۸۳) میں ایک حرف پر سکون اور دوسرے پر سکون اور کسرہ ایک ساتھ لگایا ہے جو غلط ہے، مگر اس سے اہم غلطی اشاریے (ص ۴۲۱) میں ہے۔ آیت میں "اَخْرَجَ"، فعل معروف ہے اور اشاریہ میں اسے "اُخْرِجَ" مجہول بنادیا گیا۔ ایک اور آیت میں "فضربنا علی اذانھم" متن (ص ۹۷) میں چھپا ہے جب کہ آیت میں "آذان" لفظ "اُذُن" بمعنی کان کی جمع ہے، مؤذن کی اذان مراد نہیں ہے۔ لفظ "آذان" کی الف پر عربی کی عام کتابوں میں ایک مد ہوتا ہے لیکن مصحف کا املا اس سے مختلف ہے۔ برصغیر کے مصاحف میں الف پر کھڑا زبر دیتے ہیں۔ اشاریے (ص ۴۲۱) میں آیت درست لکھی ہے۔ اسی طرح دو تین آیتوں کا املا مصحف کے مطابق ہے نہ عام مروج املا کے۔ یہ بحث اس مضمون کے دائرے سے خارج ہے، لیکن قرآنی آیات کا معاملہ نازک ہے اس لیے یہاں اس کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مالک رام کے اڈیشن میں غبار خاطر کے متن میں الفاظ کا سقوط،

تحریف، تذکیر و تانیث، املا، اعراب اور تدوین متن کے دوسرے مسائل سے بحث ایک مستقل مضمون کی متقاضی ہے۔

غبار خاطر میں عربی اشعار ۳۰ جگہوں پر آئے ہیں۔ ایک جگہ چار اشعار، دوسری جگہ تین اور دو جگہوں پر دو دو اشعار کے قطعے ہیں۔ باقی مقامات پر ایک ایک شعر اور کہیں ایک ایک مصرعے ہیں۔ اشعار کی مجموعی تعداد اٹھائیس ہے جن میں تین شعر مکرر آئے ہیں اور مصرعوں کی چھ ہے۔ آئندہ صفحات میں ان میں سے تیرہ مفردابیات، دو مصرعے اور دو قطعے زیر بحث آئے ہیں جن میں سے ایک دو شعروں کا ہے اور دوسرا چار کا۔ اشعار کے بعد ایک ضرب المثل اور حضرت علیؓ کے ایک قول پر گفتگو کی گئی ہے۔

مرتب کے حواشی میں ایک جگہ شیخ محمد عبدہ کے دو شعر درج کیے گئے ہیں اور دوسرے شعر کا متن بھی غلط ہے اور وزن سے بھی خارج ہے۔ مضمون کے آخر میں اس شعر کی بھی تصحیح کی گئی ہے۔ ایک اور حاشیے میں دیوان حافظ کی پہلی غزل کے مطلع میں

ألا یا أیها الساقی أدر كاسًا وناولها

کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ یزید کا مصرعہ ہے اور حافظ نے تضمین کی ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں یزید کی جانب منسوب شعر دراصل حافظ کے کسی بداندیش حاسد کا گھڑا ہوا ہے جو عربی زبان کے بنیادی قواعد اور عربی شاعری کی روایت دونوں سے نابلد تھا۔ اس مسئلے کا تعلق بھی عربی شاعری سے تھا، اس لیے یہاں بعض فارسی مآخذ کی عدم دستیابی کے باوجود، مناسب معلوم ہوا کہ اپنی معروضات پیش کردی جائیں۔ یوں جو مصرعہ دیوان حافظ کا مطلع تھا وہ اس مضمون کا مقطع بن گیا ہے۔

عربی اشعار پر اعراب لگانے سے قصداً گریز کیا گیا ہے کہ مزید غلطیاں وجود میں نہ آجائیں۔ البتہ کہیں کہیں مجبوراً لگانا پڑا ہے۔

اشعار کی تصحیح و تخریج کی اس بحث میں زمانی تقدم کی خاص اہمیت ہے، اس لیے مصنّفین کی تاریخ وفات درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اصل مقصود تاریخ وفات کی تحقیق نہیں بلکہ یک گونہ عہد کی تعیین ہے، اسی وجہ سے عموماً اس باب میں خیرالدین زرکلی کی الاعلام پر اعتماد کیا گیا ہے۔

(۱) ص ۵:

قليل منک يكفيني ولكن قليلک لا يقال له قليل

اس شعر کے بارے میں حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ کئی کتابوں میں ملتا ہے لیکن اس کا قائل مجہول ہے۔ اس کے بعد سمط اللآلي (۱:۴۱) اور شرح التعرف لمذہب التصوف کا حوالہ دیا ہے۔

شیخ ابوبکر کلاباذی (ف ۳۸۰ھ) کی التعرف قدیم کتاب ہے لیکن یہ شعر متن میں نہیں آیا ہے۔

ابوعبید بکری (ف ۴۸۷ھ) نے اللآلي (۱: ۴۱۰) میں مصرعہ ثانی مکمل جب کہ مصرعہ اولی کا صرف آخری لفظ نقل کیا ہے۔ کتاب کے مرتب (عربوں کی اصطلاح میں ''محقق'') مولانا عبدالعزیز میمن عربی زبان کے جلیل القدر عالم تھے، ان کی نظر بہت وسیع تھی اور حافظہ نہایت قوی۔ سمط اللآلی عالم عرب میں بجا طور پر تدوین متن کا شاہکار شمار ہوتی ہے۔ لیکن تعجب ہے انہوں نے اس مشہور شعر کے ناتمام مصرع کو مکمل کیا نہ اس پر کوئی نوٹ لکھا۔

مولانا میمن کے ذاتی کتب خانے کا ایک حصہ دارالعلوم کراچی میں محفوظ ہے۔ اس میں سمط اللآلی کا وہ مطبوعہ نسخہ بھی ہے جو ان کے استعمال میں تھا اور اس پر جا بجا ان کے قلم سے تصحیحات و استدراکات ہیں۔ برادرم جناب محمد عزیر شمس (مقیم مکہ مکرمہ) کے پاس ان صفحات کا عکس موجود ہے جن میں میمن صاحب کے قلم سے یہ حواشی ہیں۔ میرے استفسار پر موصوف نے اطلاع دی کہ میمن صاحب نے حاشیے پر صرف اتنا لکھا ہے: "حفظي : قليل منک يكفيني ولكن" گویا انہوں نے اپنے حافظے سے پہلا مصرعہ مکمل کر دیا ہے، مگر اس کا کوئی حوالہ پھر بھی نہیں دیا۔

اس شعر کا سب سے قدیم حوالہ محمد بن احمد عمیدی (ف ۴۳۳ھ) کی کتاب الابانۃ عن سرقات المتنبی (ص ۳۶) میں ملتا ہے اور وہاں بھی شاعر کا نام مذکور نہیں ہے۔ عمیدی نے اس شعر کے ساتھ بشار بن برد (ف ۱۶۷ھ) کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے اور مقصود یہ بتانا ہے کہ متنبّی (ف ۳۵۴ھ) کے مندرجہ ذیل شعر کا مضمون انہی شعروں سے ماخوذ ہے:

وقنعت باللقيا و اول نظرة ان القليل من المحب كثير

عمیدی سے قبل ابن وکیع تنّیسی (ف ۳۹۳ھ) نے اسی موضوع پر ایک ضخیم کتاب

المنصف (للسارق والمسروق منہ) کے نام سے لکھی تھی۔اس نے متنبّی کے اسی شعر کے سلسلے میں بشار (ف ۱۶۷ھ) اور اسحاق بن ابراہیم موصلی (ف ۲۳۲ھ) کے اشعار (۱:۳۱۵) نقل کئے مگر زیر بحث شعر نہیں لکھا۔یہی مضمون متنبّی کے ایک اور شعر میں آیا ہے:

وجودک بالمقام ولو قلیلا　　فما فیما تجود بہ قلیل

ابن وکیع نے اس پر بھی نقد کرتے ہوئے اشجع سلمی (ف تقریباً ۱۹۵ھ)، اسحاق موصلی (ف ۲۳۲ھ) اور ابن الرومی (ف ۲۸۳ھ) وغیرہ کے اشعار نقل کیے (۲:۱۴۲) مگر یہاں بھی زیر بحث شعر مذکور نہیں۔

قاضی ابوالحسن جرجانی (ف ۳۹۲ھ) نے اپنی کتاب الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ (ص ۲۳۳-۲۳۴) میں متنبّی کے موخرالذکر شعر کے ہم مضمون اشعار میں اسحاق موصلی اور یزید بن الطثریہ (ف ۱۲۶ھ) کی ابیات نقل کیں لیکن انہوں نے بھی یہ شعر درج نہیں کیا۔

بہر حال عمیدی کے بیان کا تقاضا یہ ہے کہ اس شعر کا زمانہ متنبّی (ف ۳۵۴ھ) سے پہلے کا ہو، یعنی تیسری صدی یا اس سے بھی پہلے کا۔اسی وجہ سے یوسف بدیعی دمشقی (ف ۱۰۷۳ھ) نے الصبح المنبی عن حیثیۃ المتنبی (۱:۳۲۴) میں جب یہ شعر نقل کیا (اور ان کا ماخذ عمیدی کی کتاب ہے) تو ''لبعض المتقدمین'' لکھا۔یعنی کسی قدیم شاعر کا شعر ہے، مگر ابن وکیع اور قاضی جرجانی کی کتابوں اور اس دور کے دوسرے معروف مآخذ میں اس شعر کی غیر موجودگی غور طلب امر ہے۔

دوسری جانب عبدالرحیم بن احمد عباسی (ف ۹۶۳ھ) نے معاہد التنصیص فی شرح شواہد التلخیص (۴:۲۵۹) میں بغیر کسی شک کے یہ شعر امیر ابونصر احمد میکالی (ف ۴۰۶ھ) کے نام سے لکھا ہے۔عباسی دسویں صدی کے محدث اور ادیب ہیں۔انہوں نے کسی ماخذ کا بھی حوالہ نہیں دیا، اس نسبت کو قبول کرنے میں تامل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابومنصور ثعالبی (ف ۴۲۹ھ) کی کتابوں میں یہ شعر نہیں ملتا حالانکہ ثعالبی کا آل میکال سے خصوصی تعلق تھا اور امیر ابونصر کے فرزند ابوالفضل عبیداللہ بن احمد بن علی (ف ۴۳۶ھ) سے ان کے دوستانہ روابط تھے۔ایک ضخیم شعری انتخاب جو بعض قلمی نسخوں میں ثعالبی اور بعض میں ابوالفضل میکالی کی جانب منسوب ہے دو جلدوں میں المنتحل کے نام سے شائع ہو چکا ہے وہ بھی اس شعر سے خالی ہے۔اگر زیر بحث مشہور

شعر ابونصر میکالی کا تھا تو خواہ اس کتاب کا مصنف ابوالفضل میکالی ہو یا ثعالبی نے اسے ابوالفضل کے نام سے معنون کیا ہو، دونوں صورتوں میں اس شعر کو کتاب کے باب الامثال والحکم والآداب کی زینت بننا تھا۔ نیز اگر عباسی کی بیان کردہ یہ نسبت درست ہے تو اس شعر کو متنبّی کے شعر کا ماخذ قرار دینا ممکن نہیں جیسا کہ عمیدی نے دعوی کیا ہے۔

بہرحال فی الوقت اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس شعر کا قدیم ترین ماخذ عمیدی (ف ۴۳۳ھ) کی کتاب الابانہ عن سرقات المتنبی ہے، اور عباسی (ف ۹۶۳ھ) نے اسے امیر ابونصر میکالی (ف ۴۰۶ھ) کی جانب منسوب کیا ہے۔

(۲) ص ۷:

کیف السبیل الی سعاد و دونها قلل الجبال و دونهن حتوف

اس شعر پر مرتب نے کوئی حاشیہ نہیں لکھا ہے۔ یہ شعر امام شافعی (ف ۲۰۴ھ) کی جانب منسوب ہے۔ اس کے بعد ایک اور شعر ہے:

الرجل حافیة ومالي مرکب والکفّ صفر والطریق مخوف

امام شافعی کی سیرت پر امام بیہقی وغیرہ نے جو مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں اور قدیم تذکروں میں یہ قطعہ نظر سے نہیں گزرا۔ امام شافعی کا دیوان کسی قدیم عالم نے غالباً مرتب نہیں کیا۔ جتنے مجموعے ہیں سب اسی دور کے ہیں۔ محمد مصطفیٰ نے ۱۹۰۳ء میں الجوہر النفیس فی اشعار الامام محمد بن ادریس کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ ہماری معلومات کی حد تک امام شافعی کے اشعار کا یہ پہلا مجموعہ تھا۔ اس کے بعد سے متعدد مجموعے شائع ہوئے اور یہ قطعہ سب میں شامل ہے۔

امام شافعی کے مجموعۂ کلام کا محققانہ اڈیشن ڈاکٹر مجاہد مصطفیٰ بہجت نے ۱۹۸۶ء میں موصل سے شعر الشافعی کے نام سے شائع کیا تھا، پھر دوسرا اڈیشن اضافوں کے ساتھ دیوان الشافعی کے نام سے دار القلم دمشق سے ۱۹۹۹ء میں چھپا۔ اس میں انہوں نے مذکورہ قطعے کے مآخذ میں ایک قلمی کتاب مناھج التوسل فی مباھج الترسل کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب عبدالرحمٰن بن محمد حنفی بسطانی (ف ۸۵۸ھ) کی تصنیف ہے اور عراقی میوزیم میں محفوظ ہے۔ امام شافعی کی جانب زیر بحث قطعے کی نسبت کا اس سے قدیم ماخذ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

مدینۃ العلوم کے مصنف محمد بن قطب الدین ازنیقی (ف ۸۸۵ھ) نے بھی پورے جزم کے ساتھ اس قطعے کو امام شافعی کے نام سے نقل کیا ہے، جیسا کہ ابجد العلوم (۱:۳۳۱) سے معلوم ہوتا ہے۔

حافظ ابن کثیر (ف ۷۷۴ھ) ان دونوں بزرگوں سے پہلے گزرے ہیں اور شافعی المسلک ہیں۔ انہوں نے البدایۃ والنہایۃ (۱۷:۲۷۷) میں یہ دونوں شعر ضرب المثل کے طور پر نقل کیے ہیں مگر شاعر کا نام ذکر نہیں کیا۔

ڈاکٹر احسان عباس نے بھی امام شافعی کا دیوان مرتب کیا جو دار صادر بیروت سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس دیوان کا ایک حصہ ان اشعار کے لیے مخصوص ہے جو امام شافعی کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ان کے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر احسان عباس نے زیر بحث قطعہ اسی حصے (ص ۸۳) میں رکھا ہے اور ان کے نزدیک یہ ابوالفداء اسماعیل بن محمد بن موھوب جزری کا ہے جسے غلطی سے زہدی یکن نے دیوان شافعی میں شامل کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تحقیق کے لیے تاریخ اربل (۱:۱۶۹-۱۷۰) کا حوالہ دیا ہے۔

کتاب مذکور کے مصنف ابن المستوفی (ف ۶۳۷ھ) نے ابوالفداء جزری کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ ماہ صفر ۵۹۹ھ میں اربل آئے، رباط مجاہدی میں قیام کیا اور یہ دونوں شعر انہوں نے اپنے حافظے اور اپنی زبان سے ہمیں سنائے۔ مصنف کے اصل الفاظ ہیں: "**من لفظه و حفظه**"۔ ان الفاظ سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اشعار خود ابوالفداء کا نتیجۂ فکر ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر احسان عباس نے سمجھا ہے۔ تاریخ اربل کے مرتب ڈاکٹر سامی الصفار نے بھی ان اشعار کو امام شافعی ہی کا قرار دیا ہے۔

(۳) ص ۱۴:

رقَّ الزجاج و رقّت الخمر   فتشابها فتشاکل الأمر

مولانا آزاد نے یہ شعر ابونواس (ف ۱۹۸ھ) کی جانب منسوب کیا ہے۔ شعر کے مضمون اور رنگ سے انہیں دھوکا ہوا۔ حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ ابوالقاسم زعفرانی کے نزدیک یہ شعر ابونواس کا ہے مگر راغب اور ابن خلکان نے صاحب بن عباد کی جانب منسوب کیا ہے اور یہی صحیح

معلوم ہوتا ہے۔

ابومنصور ثعالبی (ف ۴۲۹ھ) نے یتیمۃ الدھر (۳: ۲۵۹) میں صاحب بن عباد (ف ۳۸۵ھ) کے حالات میں اس کے اشعار کا جو انتخاب درج کیا ہے اس میں بھی یہ شعر شامل ہے اور ثعالبی کی دوسری کتابوں مثلاً خاص الخاص (ص ۴۹۲) اور من غاب عنہ المطرب (ص ۱۶۸) وغیرہ میں بھی صاحب کے نام سے مذکور ہے۔

ابن عباد کے دیوان کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس کی بنیاد پر محمد حسن آل یاسین نے ۱۹۶۵ء میں یہ دیوان مرتب کیا اور المجمع العلمی العراقی سے شائع کیا۔ ہمارے سامنے اس کا دوسرا اڈیشن ہے جو دارالقلم بیروت سے ۱۹۷۴ء میں چھپا ہے۔ اس میں صفحہ ۱۷۶ پر یہ شعر موجود ہے۔

ابوالقاسم زعفرانی کے حوالے سے جو صاحب بن عباد کے نہایت مقرب مصاحبین میں سے تھا حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ شعر ابونواس کا ہے۔ اول تو زعفرانی کا مطلب یہ نہیں ہے۔ وہ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس شعر کا مضمون ابونواس کے شعر سے اڑایا گیا ہے۔ دوسرے اس سلسلے میں راغب اصفہانی نے جو ثعالبی (ف ۴۲۹ء) کے معاصر ہیں محاضرات الادباء (۱: ۱۱۳) میں جو حکایت لکھی ہے اس کی حیثیت لطیفے سے زیادہ نہیں۔ اس کا پس منظر جاننے کے لیے ابوحیان توحیدی (ف تقریباً ۴۱۴ھ) کی کتاب اخلاق الوزیرین (ص ۱۰۵-۱۰۶) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(۴) ص ۱۷:

ألا فاسقني خمرًا وقل لي هي الخمر ولا تسقني سرًّا فقد أمكن الجهر

غبار خاطر کے متن میں صرف مصرع اولی مذکور ہے۔ طبع ثالث کے حاشیے میں دوسرا مصرعہ لکھ کر شعر کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ اس طرح کے چند حواشی جو طبع ثالث میں آئے ہیں مالک رام نے انہیں باقی رکھا ہے اگرچہ ان کے خیال میں یہ قطعی نہیں ہے کہ سب مولانا آزاد کے قلم سے ہوں۔

مالک رام کے اڈیشن میں اس شعر کے لیے دیوان ابونواس (ص ۲۸) مرتبہ احمد عبدالمجید غزالی کا حوالہ دیا گیا لیکن اس جانب اشارہ نہیں کیا گیا کہ دیوان میں دوسرے مصرعے میں ''فقد أمکن'' کی جگہ پر ''اذا أمکن'' ہے۔

جرمن مستشرق EWALD WAGNER نے دیوان ابونواس کا ایک محققانہ اڈیشن دس قلمی نسخوں کی بنیاد پر مرتب کیا جو سات جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ آخری دو ضخیم جلدیں انڈکس اور تخریج پر مشتمل ہیں۔ مرتب نے اس میں دیوان کی تین روایتیں جمع کردی ہیں: حمزہ اصفہانی (ف قبل ۳۶۰ھ) کی روایت پر بنیاد رکھی ہے اور ابوبکر صولی (ف ۳۳۵ھ) اور ابراہیم بن احمد طبری کی روایتوں کے ذریعہ تکملہ کیا ہے۔ اس اڈیشن (۳: ۱۲۷) میں بھی ''اذا أمکن'' ہے اور مرتب کے حواشی سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی مخطوطے میں بھی وہ الفاظ نہیں ہیں جو غبار خاطر میں نقل ہوئے ہیں۔

دوسرے مآخذ میں بھی عام طور پر یہی مشہور روایت پائی جاتی ہے مثلاً مرزبانی (ف ۳۸۴ھ) کی الموشح (ص ۳۵۵)، ابوہلال عسکری (ف تقریباً ۳۹۵ھ) کی دیوان المعانی (۱: ۳۰۲)، حصری (ف ۴۵۳ھ) کی زہر الآداب (۲: ۲۶۴) اور اسامہ بن منقذ (ف ۵۸۴ھ) کی البدیع (ص ۵۷)۔ ابن رشیق (ف ۴۶۳ھ) نے البتہ کتاب العمدہ (۲: ۹۴) میں مشہور روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ایک روایت ''فقد أمکن'' بھی ہے۔ میرا خیال ہے یہاں روایت کا لفظ اصطلاحی معنی میں نہیں آیا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ بعض کتابوں میں اس طرح بھی نقل ہوا ہے۔

(۵) ص ۳۹:

تداویت من لیلی بلیلی عن الهوی كما يتداوى شارب الخمر بالخمر

حاشیہ نگار نے یہ لکھنے کے بعد کہ اس شعر کا قائل معلوم نہیں ہوسکا، التمثیل والمحاضرۃ اور الحماسۃ البصریہ کا حوالہ دیا ہے۔

بعض مآخذ میں یہ شعر قیس بن ذریح کی جانب منسوب ہے جو اپنی محبوبہ لبنیٰ کی نسبت سے ''قیس لبنیٰ'' کے لقب سے مشہور ہے۔ مثلاً اسامہ بن منقذ (ف ۵۸۴ھ) کی البدیع (ص ۲۳۶) اور عبدالقادر بغدادی (ف ۱۰۹۳ھ) کی خزانۃ الادب (۱۱: ۴۳۴)۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر حسین نصار نے قیس بن ذریح کے مجموعے (ص ۹۵) میں اس شعر کو بھی شامل کیا ہے۔

لیکن بیشتر قدیم وجدید مآخذ اسے قیس بن الملوح یعنی مجنونِ بنی عامر کی جانب (جسے لیلیٰ کی نسبت سے مجنونِ لیلیٰ بھی کہتے ہیں) منسوب کرتے ہیں، مثلاً ابن ابی عون (ف ۳۲۲ھ) کی کتاب التشبیہات (ص ۲۱۳)، مرزبانی (ف ۳۸۴ھ) کی الموشح (ص ۴۱۷) میں ابوبکر صولی

(ف ۳۳۵ھ) کی روایت سے، السری الرفاء (ف ۳۶۲ھ) کی المحب والمحبوب (۴: ۳۰۷) اور ان سب سے پہلے محمد بن داود اصبہانی (ف ۲۹۷ھ) نے کتاب الزھرۃ (۱: ۷۶) میں تین ابیات نقل کی ہیں جن میں پہلا شعر یہی ہے۔

یہ شعر مجنونِ لیلیٰ کے ایک قصیدے میں آیا ہے۔ استاذ عبدالستار فراج نے مجنوں کے دیوان (ص ۱۲۲، ۱۲۵) میں قصیدے کی مختلف روایات جمع کر دی ہیں۔ مزید تخریج کے لیے دیوان کی جانب رجوع کیا جا سکتا ہے۔

(۶) ص ۴۰:

عباراتنا شتّٰی وحسنک واحد وکلّ الی ذاک الجمال یشیر

اس شعر پر کوئی حاشیہ موجود نہیں۔

شاعر کا نام معلوم نہ ہو سکا، البتہ مندرجہ ذیل مآخذ میں یہ شعر نظر سے گزرا۔

۱- بدرالدین زرکشی (ف ۷۹۴ھ) کی البرھان فی علوم القرآن (۲: ۱۶۰)۔

۲- حکیم داود انطاکی (ف ۱۰۰۸ھ) کی تزیین الاسواق (۲: ۱۲۹)۔

۳- ملا علی قاری (ف ۱۰۱۴ھ) کی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح (۴: ۱۷۱۵)۔

۴- محمد علی بن محمد علان صدیقی (ف ۱۰۵۷ھ) کی دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین (۲: ۲۶۳)۔

مضمون اور طرز سے گمان ہوتا ہے کہ ابن عربی کا شعر ہوگا۔ ابن عربی کے دیوان میں چند اشعار اس زمین میں موجود بھی ہیں مگر یہ شعر نہیں ہے۔

(۷) ص ۵۰، ۱۰۲:

أتاني هواها قبل أن أعرف الهوی فصادف قلبًا فارغًا فتمکّنا

یہ شعر غبار خاطر میں دوبار آیا ہے، پہلی بار اس پر کوئی حاشیہ نہیں ہے۔ البتہ دوبارہ آیا تو اس کی تخریج میں ابن قیم کی دو کتابوں اغاثۃ اللہفان اور الداء والدواء کا حوالہ دیا گیا اور ساتھ ہی یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ مولانا آزاد نے غالبًا یہ شعر اغاثۃ اللہفان میں دیکھا ہوگا۔ واضح رہے کہ ابن قیم کی ان دونوں کتابوں میں شاعر کا نام مذکور نہیں۔

ماٰخذ میں اس شعر کی نسبت عام طور پر دو شاعروں کی جانب ملتی ہے: مجنونِ بنی عامر اور یزید بن الطثریۃ (ف ۱۲۶ھ) ۔ جاحظ (ف ۲۵۵ھ) نے البیان والتبیین (۲: ۴۱-۴۲) اور کتاب الحیوان (۱۶۹:۱)، (۴: ۱۶۷) میں یہ شعر مجنونِ بنی عامر کے نام سے نقل کیا ہے۔ بعد کی کتابوں میں بھی یہ نسبت کہیں کہیں ملتی ہے۔ استاذ عبدالستار فراج نے مجنوں کا دیوان مرتب کیا تو انہی ماٰخذ کی بنیاد پر یہ شعر اور اس سے قبل ایک اور شعر دیوان (ص۲۱۹) میں شامل کیے۔

جن علماء اور ادیبوں نے اس شعر کا قائل یزید بن الطثریہ (ف ۱۲۶ھ) کو بتایا ہے ان میں محمد بن داود بن الجراح (ف ۲۹۶ھ)، ابوبکر محمد بن داود اصبہانی (ف ۲۹۷ھ) اور ابن الشجری (ف ۵۴۲ھ) ہیں۔ ابن الجراح کا حوالہ ابوبکر صولی (ف ۳۳۵ھ) نے اخبار ابی تمام (ص ۲۶۴) اور آمدی (ف ۳۷۰ھ) نے الموازنہ بین ابی تمام والبحتری (۱: ۶۹) میں دیا ہے۔ صولی اور آمدی بجائے خود سربرآوردہ ادیب اور مصنف ہیں۔ ابوبکر اصبہانی نے کتاب الزہرۃ (۱: ۶۱-۶۲) میں ابن الطثریہ کے پانچ اشعار نقل کیے ہیں منجملہ ان کے یہ شعر بھی ہے۔ ابن الشجری نے اپنی حماسہ (۱:۱ ۵۰) میں اس شعر کے ساتھ دو اشعار نقل کیے ہیں۔

اس سلسلے میں ابن الجراح اور ابوبکر اصبہانی سے زیادہ اہم شخصیت علی بن عبداللہ طوسی کی ہے۔ طوسی کی تاریخ وفات معلوم نہیں لیکن ابوعبید القاسم بن سلام کے تلمیذ خاص تھے۔ ابوعبید کی وفات ۲۲۴ھ میں ہوئی۔ یوں طوسی جاحظ (ف ۲۵۵ھ) کے معاصر ہوں گے۔ عرب قبائل کی تاریخ، شعرا کے تذکرے اور دواوین کی روایت ان کا خاص فن تھا۔ انہوں نے یزید بن الطثریہ کا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ یہ دیوان جو افسوس کہ آج ناپید ہے ساتویں صدی میں موجود تھا اور ابن خلکان (ف ۶۸۱ھ) نے دیکھا تھا۔ چنانچہ وفیات الاعیان میں یزید بن الطثریہ کے حالات میں انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کے حوالے سے یزید کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں (۶: ۳۷۰) زیر بحث شعر بھی ہے۔

۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر حاتم صالح الضامن نے یزید کا شعری مجموعہ مرتب کیا۔ اس میں (ص ۹۴) اس قصیدے کے گیارہ اشعار شامل ہیں۔

تیسری صدی ہجری کے مشہور مصنف ابن قتیبہ (ف ۲۷۶ھ) کی کتاب عیون الاخبار

(۹:۳) میں یہ شعر عمر بن ابی ربیعہ (ف ۹۳ھ) کے نام سے ملتا ہے۔ یہ نسبت درست نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اس شعر کا رنگ عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری سے مختلف ہے، عمر کے دیوان میں جو قدیم مخطوطات کی بنیاد پر مرتب اور متداول ہے یہ شعر موجود نہیں، بلکہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی نہیں ہے۔

اسی طرح حافظ ابن عبدالبر (ف ۴۶۳ھ) کی کتاب بہجۃ المجالس (۲: ۸۲۵) میں یہ شعر حبیب یعنی ابوتمام (ف ۲۳۱ھ) کے نام سے آیا ہے۔ حافظ موصوف کو یا تو غلط فہمی ہوئی یا متن میں ابوتمام کا مندرجہ ذیل شعر ساقط ہے:

نقّل فؤادک حیث شئت من الھوی　　ما الحبّ الا للحبیب الأول

ابن الجراح نے اسی شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ ابوتمام نے یہ مضمون یزید بن الطثر یہ کے زیر بحث شعر سے اڑایا ہے۔ ملاحظہ ہو آمدی کی الموازنہ (۱:۶۹)۔

(۸) ص ۱۷۴:

و جبال لبنان و کیف بقطعھا　　وھي الشتاء و صیفھنّ شتاء

حاشیہ نگار نے وضاحت کی ہے کہ دیوان متنبّی میں "وعقاب لبنان" اور "وھو الشتاء" ہے۔

دیوان متنبّی کا مذکورہ اڈیشن ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے قلمی نسخوں اور دیوان کی مشہور شرحوں کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مولانا آزاد نے جس طرح لکھا ہے اس کی تائید کسی نسخہ سے ہوتی ہے نہ کسی شرح سے۔ البتہ میرا خیال ہے دوسرے مصرعہ میں "وھي الشتاء" مولانا کے حافظے کا تصرف ہے۔ ذہن غلطی سے پاس کی ترکیب "بقطعھا" میں مونث ضمیر کی طرف چلا گیا اور "وھو" کو "وھي" بنادیا۔ واضح رہے کہ "وھو الشتاء" میں مذکر ضمیر کا مرجع "الزمن" یا "الوقت" ہے جو مذکور نہیں ہے مگر سیاق سے سمجھ میں آرہا ہے۔

جہاں تک مصرعہ اولی میں "وجبال لبنان" کے الفاظ کا تعلق ہے تو وہ بعض کتابوں میں آئے ہیں، یعنی یہ مولانا کے حافظے کی غلطی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو شہاب الدین نویری (ف ۷۳۳ھ) کی کتاب نہایۃ الارب (۳۰: ۳۰۵)۔ اس تبدیلی کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ

اس شعر سے پہلے جو شعر ہے اس میں متنبّی کہتا ہے:

بيني و بين أبي علي مثله شمّ الجبال و مثلهن رجاء

یعنی میرے اور ابوعلی کے درمیان ابوعلی کی بلند و بالا شخصیت ہی جیسے اونچے پہاڑ حائل ہیں، اور ابوعلی سے جو امیدیں وابستہ ہیں وہ بھی انہی پہاڑوں جیسی ہیں۔ اس کے بعد دوسرے شعر میں ''عقاب لبنان'' یعنی کوہِ لبنان کی گھاٹیوں کا ذکر کیا ہے۔ دونوں شعر ساتھ ہوں تو ظاہر ہے ''شمّ الجبال'' کہنے کے بعد ''جبال لبنان'' کہنا موزوں نہ ہوگا، لیکن جب تنہا یہی شعر زبانوں پر رہ جائے تو حافظہ آسانی سے ''عقاب'' کی جگہ ''جبال'' رکھ دے گا۔ معنی میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ زور میں کچھ اضافہ ہی ہوگا۔ اس لیے قطع نظر اس سے کہ متنبّی نے ''وعقاب لبنان'' ہی کہا تھا اس تصرف سے معنی اور وزن میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

(۹) ص ۱۸۰:

فقلت لها ما أذنبت قالت مجيبة وجودک ذنب لا يقاس به ذنب

اس شعر کا مصرعہ اولی وزن سے خارج ہے۔ طبع اول میں یہ مصرعہ اسی طرح چھپا ہے اور طبع ثالث میں بھی جس کی صحت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ خدا جانے یہ غلطی مولانا کے مسودے کی ہے یا نقل نویس کی۔ اگر مولانا کو اصل شعر یاد نہ تھا چنانچہ انہوں نے ہی اس طرح لکھا تو تعجب ہے کہ مصرعے کے ناموزوں ہونے کا احساس کیوں نہیں ہوا۔ حالانکہ ذرا سی ترمیم سے مصرعہ کو موزوں کیا جا سکتا تھا مثلاً:

۱- فقلت لها : أذنبت ؟ قالت مجيبة

۲- فقلت لها : ما الذنب ؟ قالت مجيبة

۳- فقلت : وما ذنبي ؟ فقالت مجيبة

۴- فقلت : وما أذنبت ؟ قالت مجيبة

اور اگر کاتب کی غلطی تھی تو وہ مصححین کی تیز نگاہوں سے مسلسل بچنے میں کیسے کامیاب ہوتی رہی؟ بہرحال مرتب نے اس شعر پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

''معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ کشف المحجوب (ص ۳۸۲) میں

ملتا ہے۔ابن خلکان نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ جنیدا سے بڑے ذوق وشوق سے
پڑھا کرتے تھے (وفیات الاعیان ۱:۳۷۴)''۔

اس کے بعد شعر کے متن کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ کشف المحجوب میں ''فقلت''
کی جگہ ''اذا قلت'' ہے اور وفیات الاعیان میں ''ان قلت'' ۔

یہ بات کہ شیخ جنید یہ شعر بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے، وفیات الاعیان میں مطلق
مذکور نہیں، بلکہ کہیں اور بھی میری نظر سے نہیں گزری! دوسرے متن کے جس فرق کی نشاندہی کی گئی
ہے وہ ناقص ہے اور مکمل طور پر درست بھی نہیں۔

اصل میں یہ تین ابیات کا قطعہ ہے۔حافظ محبّ الدین ابن النجار (ف ۶۴۳ھ) نے
الذیل علی تاریخ بغداد (۱:۱۰۲) میں عبدالملک بن عبدالسمیع ہاشمی کے حالات میں شیخ شبلی کے
حوالے سے یہ واقعہ لکھا ہے جو انہوں نے شیخ جنید کی زبان سے سنا تھا۔ وہ نقل کرتے ہیں کہ شیخ
جنید نے فرمایا: میں نے ایک بار چند ابیات سنی تھیں اور جو فائدہ مجھے ان سے پہنچا وہ کسی اور چیز
سے حاصل نہیں ہوا۔ پھر یہ قصہ سنایا کہ درب القراطیس (بغداد کا ایک محلّہ) سے میں گزر رہا تھا
کہ ایک مکان سے گانے کی آواز آئی۔غور کیا تو کوئی لونڈی یہ اشعار گا رہی تھی:

اذا قلت : أهدى الهجر لي حلل البلى تقولين : لولا الهجر لم يطب الحبُّ

(جب میں کہتا ہوں کہ ہجر نے ناتوانی اور بے طاقتی کا تحفہ دیا تو تم کہتی ہو: اگر ہجر نہ ہوتا تو محبت کا لطف
جاتا رہتا)

وان قلت : هذا القلب احرقه الهوى تقولي : بنيران الهوى شرف القلبُ

(اور اگر یہ کہتا ہوں کہ عشق نے اس دل کو جلا کر خاکستر کر دیا تو تم کہتی ہو: دل کو جو عزت اور توقیر ملی وہ اسی
آتش عشق کی بدولت ملی)

وان قلت : ما اذنبت ؟ قلت مجيبة حياتک ذنب لا يقاس به ذنب

(اور اگر کہتا ہوں کہ آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ تو تم جواب دیتی ہو: تمہارا وجود بجائے خود ایک گناہ ہے
اور ایسا کہ اس کے آگے ہر گناہ ہیچ ہے)

شیخ جنید فرماتے ہیں کہ یہ اشعار سن کر میری چیخ نکل گئی اور مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ چیخ

سن کر مالکِ مکان باہر نکلا اور میرا حال دریافت کیا۔ میں نے کہا: ان ابیات سے میرا یہ حال ہوا۔ وہ بولا: یہ لونڈی میں آپ کو ہبہ کرتا ہوں۔ میں نے کہا: مجھے قبول ہے اور میں اسے اللہ واسطے آزاد کرتا ہوں۔

یہ واقعہ اسی طرح ابن خلکان (ف ۶۸۱ھ) نے وفیات الاعیان (۱:۳۷۴) میں نقل کیا ہے اور گمان غالب یہ ہے کہ ان کا ماخذ الذیل علی تاریخ بغداد ہے۔ ابن خلکان سے صلاح الدین صفدی (ف ۷۶۴ھ) نے الوافی (۱۱: ۲۰۲)، ابن کثیر (ف ۷۷۴ھ) نے البدایۃ والنہایہ (۱۴: ۷۶۹) اور ابن حجۃ حموی (ف ۸۳۷ھ) نے ثمرات الاوراق (۱: ۷۹) میں نقل کیا، ابن کثیر اور ابن حجہ نے اپنے ماخذ کی صراحت کی ہے۔ ابن العماد (ف ۱۰۸۹ھ) نے شذرات الذھب (۳: ۴۱۸) میں یہ حکایت نقل کی اور صرف انہوں نے '' حیاتک '' کی جگہ پر ''وجودک'' لکھا۔

البدایہ والنہایہ کے پرانے اڈیشنوں میں غلطی سے ''قلت مجیبۃ'' کے بجائے ''قالت مجیبۃ'' چھپا تھا۔ شذرات الذھب میں بھی ''قالت'' چھپا ہے لیکن جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے تینوں اشعار میں من وتو کے درمیان مکالمہ ہے اور تینوں کا مضمون ایک ہی انداز میں باندھا گیا ہے اس لیے جب یکجا ہوں تو ''قالت'' درست نہ ہوگا۔

البتہ بعد میں جب تیسرا شعر قافلے سے بچھڑ کر تنہا رہ گیا اور سیاق سے آزاد ہوگیا تو اس تبدیلی کا امکان پیدا ہوگیا۔ چنانچہ کشف المحجوب میں پہلا مصرعہ اس طرح آیا ہے:

اذا قلت ما أذنبت قالت مجیبۃ

یہاں ایک اور تبدیلی ہوئی وہ یہ کہ ''وان قلت'' کی جگہ پر ''اذا قلت'' کہہ دیا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ شعر اپنے سیاق میں نہیں رہا۔ مولانا آزاد کی نظر سے مصرعے کی یہی صورت گزری ہوگی لیکن جب یاد نہ رہی تو حافظے نے تصرف کیا اور ان الفاظ کی جگہ پر ''فقلت لھا'' رکھ دیا اور شعر موزوں باقی رہا۔ خرابی ''ما'' کے اضافے سے پیدا ہوئی اور یہ اضافہ معلوم نہیں مولانا کے قلم کا سہو تھا یا مولوی اجمل خاں یا کاتب یا لاہور کا کوئی مصحح اس کا ذمہ دار تھا۔ بہرحال وفیات الاعیان اور کشف المحجوب دیکھنے کے بعد شعر کی تصحیح ممکن تھی مگر مرتب یا ان کے

معاون حاشیہ نگار کو مصرعے کے ساقط الوزن ہونے ہی کا احساس نہ ہوا تو وہ اس مسئلے پر غور کیا کرتے!

(۱۰) ص ۱۸۰:

أراک عصيّ الدمع شیمتک الصبر أمـا لـلهـوی نهـي علیک و لا أمر

ابوفراس حمدانی کے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ''اما'' کی میم پر تشدید دی گئی ہے جس سے شعر بے وزن ہوگیا اور بے معنی بھی۔ شعر میں ''امـــا'' دو حرف ہیں: ہمزۂ استفہام اور ''ما'' نافیہ ''امّا'' جو حرف تفصیل وشرط ہے اس کا یہاں موقع نہیں۔

اعراب کی ایک اور غلطی بھی اس مصرعے میں ہے وہ یہ کہ ''نهـي'' کے آخری حرف پر ایک پیش لگایا ہے حالانکہ تنوین ہونی چاہیے۔

یہ دونوں غلطیاں مالک کے اڈیشن کی ہیں۔

(۱۱) ص ۱۸۰:

مولانا آزاد نے ابن سناء الملک کے دو شعر نقل کیے ہیں۔ دوسرا شعر یہ ہے:

وما أنا راضٍ إنـني والطئ الثری ولي همة لا ترتضیٰ الافُقُ مقعدا

اس شعر میں متعدد غلطیاں ہیں:

۱- مصرعہ اولی میں ''أنـني'' ہونا چاہیے۔ حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ ابن سناء الملک کے دیوان میں اس کی جگہ ''إن أری'' ہے۔ دیوان کا ہندوستانی اڈیشن میرے سامنے نہیں لیکن اگر واقعی اس میں اسی طرح ہے تو غلط ہے۔ یہاں ''إن'' شرطیہ کی جگہ ''أن'' مصدریہ ہے اور ''اری'' مجہول ہے۔

۲- دوسرے مصرعے میں ''لا تـرتضیٰ'' ضاد پر کھڑے زبر کے ساتھ طبع ثالث میں بھی چھپا ہے جو کاتب کی غلطی ہے۔ صحیح ''لا ترتضي'' فعل معروف ہے۔

۳- ''الافـق'' مفعول بہ واقع ہوا ہے اس لیے مرفوع کی بجائے منصوب ہے، اور اس کے آخر میں پیش کی جگہ زبر ہونا چاہیے۔

۴- لفظ ''الافق'' کی ف پر بھی پیش لگایا ہے چنانچہ مصرعہ وزن سے خارج ہوگیا۔ عربی

زبان میں یہ لفظ ضم ثانی کے ساتھ بھی ہے جیسا کہ اردو میں بولتے ہیں اور سکون ثانی کے ساتھ بھی قفل اور قرب کے وزن پر۔ اس شعر میں یہی دوسری صورت ہے۔ مشہور راجز رؤبہ بن العجاج (ف ۱۴۵ھ) کے اس رجز میں دونوں شکلیں جمع ہوگئی ہیں:

ويغتـزي مـن بعـد افـق افقـا

ملاحظہ ہو تاج العروس (افق)۔ پہلی بار ف ساکن ہے اور دوسری بار مضموم۔ ابن دراج قسطلی (ف ۴۲۱) کے درج ذیل شعر میں اس کے برعکس ہے:

هم فئة الاسلام ان شهدوا الوغى وهـم افـق لـلملک ان نزلوا افقا

ملاحظہ ہو دیوان ابن دراج (ص ۶۸)

(۱۲) ص ۱۸۹:

ولـلأرض مـن كـأس الكرام نصيب

حاشیہ نگار نے اس کا پہلا مصرعہ:

شـربـنـا وأهـرقنا على الأرض فضلة

درج کرنے کے بعد فیہ مافیہ: ۷۰، مکاتیب سنائی: ۴، جمہرۃ الامثال ۲: ۱۶۶، اور احیاء علوم الدین ۴: ۱۷ کا حوالہ دیا اور لکھا کہ شاعر کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

یہ دوشعروں کا قطعہ ہے، پہلا شعر یہ ہے:

شـربـنـا شـرابـًا طيبًـا عـنـد طيّب كـذاک شـراب الطيبين يطيب

زمخشری (ف ۵۳۸ھ) نے ربیع الابرار (۳: ۲۴۴) میں یہ حکایت لکھی ہے کہ ایک بدوی نے موصلی کے پاس نبیذ نوش کی تو ضیافت سے خوش ہوکر یہ شعر کہے۔ ربیع الابرار کا جو اڈیشن میرے سامنے ہے اس میں صرف پہلا شعر ہے، میرا خیال ہے یہ اس اڈیشن کا نقص ہے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ محمد بن قاسم بن یعقوب حنفی (ف ۹۴۰ھ) نے ربیع الابرار کا ایک انتخاب ''روض الاخیار المنتخب من ربیع الابرار'' کے نام سے تیار کیا تھا، وہ شائع ہو چکا ہے اور اس اس میں ص ۲۸۶ پر یہ حکایت دونوں اشعار کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

اس واقعے میں موصلی سے مراد بظاہر مشہور ادیب اور مغنی اسحاق بن ابراہیم موصلی ہے

اسحاق کی وفات ۲۳۵ھ میں ہوئی۔ گویا یہ اشعار کسی بدوی کے ہیں جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا نصف اول ہے۔

ابو حیان توحیدی (ف ۴۱۴ھ) نے البصائر والذخائر (۱: ۱۲۱) میں لفظ اہرق کے استعمال پر زیر بحث شعر سے استشہاد کیا ہے۔ اس سے ربیع الابرار کی حکایت کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی اس شعر کا قائل ایسا شخص ہے جس کے کلام کو دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

امام غزالی (ف ۵۰۵ھ) کی احیاء العلوم میں دونوں شعر مذکور ہیں اور یہ کتاب سب سے قدیم ماخذ ہے، زمخشری کی وفات امام غزالی کے بعد ۵۳۸ھ میں ہوئی۔ لیکن زیر بحث شعر (جس کا دوسرا مصرعہ غبار خاطر میں آیا ہے) کا قدیم ترین ماخذ حمزہ بن الحسن اصفہانی کی کتاب الامثال الصادرۃ من بیوت الشعر (ص ۶۲) ہے۔ حمزہ کا انتقال ۳۵۱ھ کے بعد اور ۳۶۰ھ سے قبل ہوا۔ حمزہ کی یہ اہم اور ضخیم کتاب ابھی چار سال قبل شائع ہوئی ہے۔ اس میں شعر کا متن اس طرح ہے:

شربنا و اهرقنا علی الارض سؤرنا ولـلأرض من سؤر الكرام نصيب

ابو ہلال عسکری (ف تقریباً ۳۹۵ھ) نے جمہرۃ الامثال (۲: ۱۹۰) میں صرف دوسرا مصرعہ نقل کیا ہے اس میں بھی "سؤر الکرام" ہے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ ابو ہلال کا ماخذ حمزہ کی کتاب ہو۔

شعر کے دونوں مصرعے مشہور متن کے مطابق سب سے پہلے ابو حیان (ف ۴۱۴ھ) کی البصائر والذخائر (۱:۱۲۱) میں ملتے ہیں۔ ابو منصور ثعالبی (ف ۴۳۴ھ) نے التمثیل والمحاضرۃ (ص ۲۰۳) میں صرف دوسرا مصرعہ نقل کیا ہے۔ ابو سہل زوزنی (ف تقریباً ۴۴۵ھ) نے قشر الفسر (ص ۲۸۱) میں مکمل شعر درج کیا، لیکن پہلے مصرعے میں "فـضلـة" کی جگہ "حـظّـها" لکھا ہے۔

(باقی)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی قرآن فہمی

پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (متوفی ۱۹۲۰ء) برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کے ایسے عظیم قائد تھے کہ جنہیں سیاسی بصیرت کی رو سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (متوفی ۱۷۶۲ء) کے بعد دوسری بڑی اور اہم شخصیت قرار دیا جاتا ہے۔ان کے شاگردوں کی عظمت بھی کوہِ ہمالہ سے کم نہ تھی۔ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا منصور انصاریؒ، مولانا سید اصغر حسینؒ، مولانا سید فخر الدین احمدؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، اور مولانا حبیب الرحمٰن وغیرہم جیسے مشاہیر ان کے تلامذہ میں شامل تھے۔تلامذہ کی عظمت و رفعت سے استاذِ محترم کی شان و شوکت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

قرآنیات کے نامور اسکالر ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے لکھا ہے:

> ’’جس طرح بارہویں صدی ہجری کے مجددِ اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۶۲ء/۱۱۷۶ھ) کی عظمت و جلالت اور خصوصاً جامعیت کبریٰ کا مظہر ان کی تصانیف ہیں۔اسی طرح چودہویں صدی ہجری کے مجدد شیخ الہند مولانا محمود حسن کی عظمت و جامعیت کے مظہر کامل ان کے عظیم تلامذہ ہیں۔‘‘(۱)

مولانا محمود حسنؒ بنیادی طور پر مصلح، عالم اور شیخ طریقت تھے۔ان کا اصلی کام درس و تدریس اور تزکیہ و تربیت تھا۔انہیں بعض حالات اور قومی ضروریات کے تحت عملی سیاست میں حصہ لینا پڑا۔انہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف علماء کو آمادہ کیا۔انہیں مسجد کے حجروں اور درس کے

ڈائریکٹر سیرت چیئر، ڈین کلیہ معارفِ اسلامیہ، جامعہ کراچی۔

حلقوں سے باہر نکالا۔ (۲) عملی سیاست نے انہیں وسیع القلب اور وسیع النظر بنا دیا تھا۔ وہ معاصر علماء کے قدر دان تھے۔

مولانا کی سیاسی بصیرت، برصغیر میں اسلامی تشخص کے احیاء اور تحریک آزادی کی جدو جہد میں ان کے قائدانہ کردار پر اہل علم و دانش نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور ہنوز لکھا جا رہا ہے۔ مگر میں نے ان کی پہلو دار شخصیت کے ایک ایسے رُخ سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے، جس پر میرے ناقص علم کے مطابق، خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دینوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔ (۳)

جب شیخ الہندؒ، اسیری سے رہائی پا کر وارد ہند ہوئے تو انھوں نے اپنے تمام تلامذہ اور مسترشدین کو ہدایت کی کہ اپنی تمام تر توجہات کو خدمت قرآن پر مرکوز کر دیں۔ جس کا مظہر آن کا خطبۂ دیوبند ہے۔ (بروایت مفتی محمد شفیع، (متوفی ۱۹۷۶ء) (۴)

یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ مولانا محمود حسنؒ نے مالٹا میں قید و بند کا زمانہ نہایت عزم و ہمت اور صبر و استقلال سے گزارا۔ ان کا بیشتر وقت عبادت میں گزرتا رہا۔ انھوں نے یہیں قرآن مجید کا اردو ترجمہ مکمل کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے شاید مالٹا جیل میں محبوس ہی اس لیے فرمایا تھا کہ وہ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کر سکیں۔ سورۃ المائدہ یا النساء تک حواشی تحریر فرمائے تھے کہ رہائی مل گئی اور بقیہ حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (متوفی ۱۹۴۹ء) نے پورے کیے۔ (۵)

شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کا نام ''موضح فرقان'' ہے۔ یہ ترجمہ، جس اردو ترجمہ کے تتبع میں ہوا ہے وہ مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ (متوفی ۱۲۳۰ھ) کا ترجمہ ''موضحِ قرآن'' ہے جو جدید

اصطلاح میں اردو کا پہلا بامحاورہ ترجمہ مانا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۲۰۵ھ میں اپنا ترجمہ مکمل کیا اور ان کے بعد ان کے بھائی مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ (متوفی ۱۲۳۳ھ) نے اپنا ترجمہ، تحت لفظی میں مکمل کیا۔

شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ ان کے بامحاورہ ترجمے میں اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ محاورہ قرآنی مدلول کے تابع رہے۔ ایسا نہ ہو کہ مدلولِ قرآنی کو محاورۂ زبان پر قربان کردیا جائے۔(۶) اردو زبان میں یہ قرآن مجید کا وہ پہلا ترجمہ ہے جسے بعد کے تقریباً تمام ہی علماء نے سند کے طور پر مانا ہے۔ مفتی محمد شفیعؒ نے لکھا ہے:

> ''حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اسے چالیس سال مسجد میں معتکف رہ کر پورا کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کا جنازہ مسجد ہی سے نکلا۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا فرمانا ہے کہ بلاشبہ یہ ترجمہ الہامی ہے۔ انسان کے بس کی بات نہیں کہ ایسا ترجمہ کرسکے۔ شیخ العرب والعجم سیدی حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ نے اپنے وقت میں جب یہ دیکھا کہ اب بہت سے محاورات بدل جانے کی وجہ سے بعض مقامات میں ترمیم کی ضرورت ہے تو انہوں نے اسی ترجمہ کی یہ خدمت انجام دی۔ جو ترجمہ شیخ الہندؒ کے نام سے معروف ومشہور ہوا۔ احقر نے قرآنِ کریم کے زیرِ متن اسی ترجمہ کو بعینہٖ لیا ہے''۔(۷)

مفتی محمد شفیع نے اپنی معروف تفسیر معارف القرآن میں اپنا ذاتی ترجمہ کرنے کی بجائے مولانا محمود حسن، شیخ الہندؒ کے ترجمے پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اسے ہی قرآنی متن کے نیچے، بغیر کسی ترمیم کے بعینہٖ رقم کیا ہے۔ اس سے ترجمہ کی صرف معنوی صحت ہی کا نہیں بلکہ کم وبیش ستاون سال (۸) گزرنے کے بعد محاورۂ اردو کی اصابت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ مفتی محمد شفیعؒ، شیخ الہند کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ اور ان کے درسِ بخاری میں غیر رسمی شرکت کا شرف بھی انہیں حاصل تھا۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

> ''بچپن سے متوسط تعلیم عربی تک شیخ العرب والعجم سیدی حضرت

مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند قدس سرہ کی خدمت میں حاضری دی، کبھی کبھی
درس بخاری کی غیر رسمی حاضری نصیب رہی، مالٹا جیل سے واپس تشریف لانے
کے بعد انہی کے دست حق پرست پر بیعت طریقت نصیب ہوئی۔"(۹)

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوا۔ جبکہ شیخ الہند کا ۱۳۳۶ھ کو(۱۰) یوں ان دونوں ترجموں کے درمیان ایک سو اکتیس (۱۳۱) سالوں کا فاصلہ ہے۔ زبان و ادب کے پہلو سے یہ فاصلہ کم نہیں تھا۔ اس عرصہ میں اردو زبان کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔ زمانوں کے فرق سے کسی بھی زبان میں کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ اس کی حقیقت تاریخ لسانیات کے ماہرین سے پوچھیے۔ اس لیے شیخ الہندؒ نے بجا طور پر صحیح کیا کہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کو عصری تقاضوں کے مطابق ایسے اسلوب میں منتقل کیا، جو عام لوگوں کے لیے یسیر الفہم تھا۔ اگر شیخ الہندؒ یہ ترجمہ نہ کرتے تو شاہ عبدالقادرؒ بُعد زمانہ کے اثر اور غیر مانوس محاوروں کے سبب عوام الناس میں قصۂ پارینہ بن سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے پہلے ترجمے کو بتقاضائے ضرورت، قدرے ترمیم کے ساتھ از سر نو پیش کر کے دراصل شاہ صاحبؒ کے ترجمے کو نیا جنم دیا اور اس طرح ماضی کو حال سے وابستہ کر کے قدیم و جدید کے فرق کو ختم کر دیا۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مترجم قرآن کی حیثیت سے شاہ عبدالقادرؒ نے شیخ الہند کی صورت میں دوسرا جنم لیا تھا۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید۔!

شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کو اپنے ترجمے کی بنیاد بنانے کے لیے شیخ الہندؒ کے نزدیک آخر وہ کیا اسباب تھے جن کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہے؟ اس میں ایک سبب تو یہ تھا کہ شاہ صاحبؒ کے بعض کلمات و محاورات شیخ الہندؒ کے زمانے میں متروک ہو چکے تھے یا پھر قریب المتروک تھے۔ اور دوسرا سبب یہ تھا کہ شاہ صاحبؒ کے ہاں کلماتِ قرآنی کی موافقت اور مطابقت کا خیال بہت زیادہ کیا گیا تھا اور شروطِ ترجمہ کی پابندی بھی بہت زیادہ کی گئی تھی، بایں سبب بوجہ اختصارِ عبارت شیخ الہندؒ کے دور کے سہولت پسند طبائع کو قرآنی مطالب کے سمجھنے میں بہت دقت معلوم ہوتی تھی۔ شیخ الہندؒ نے اصلاً انہی دو اسباب کے پیش نظر شاہ صاحب کے ترجمے کے احیاء کا فیصلہ کیا۔ اس

Revival کا ایک فائدہ اور بھی ان کے پیش نظر تھا۔ یعنی آزادخیالی کی روش کے تحت جوتراجم عوام میں مقبول ہورہے تھے ان سے عوام کی توجہ کو ہٹایا جائے، اوراس کے لیے کرنے والی بات یہی ہوسکتی تھی کہ آزادخیالی کی روش کا مقابلہ شاہ صاحبؒ کے ترجمے کی مدد سے کیا جائے اوراس طرح مسلمانوں کوایک بارپھران کے شاندار ماضی سے ہمکنار کردیا جائے۔

گویا بقولِ اقبالؒ!

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا۔!
وہی جام گردش میں لا ساقیا

شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنے ترجمے میں ترتیب قرآن کا بہت خیال رکھتے ہیں اورقرآنی متن اوراس کے ترجمے میں مطابقت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کا ترجمہ بامحاورہ ہے۔ اس لیے بعض موقعوں پرانہیں ازروئے ضرورت توضیح وتسہیل کے لیے تقدیم وتاخیر بھی کرنی پڑی ہے، مگراس طرح کی تقدیم و تاخیر آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تقدیم وتاخیر کی مثال کے لیےانہوں نے لکھا ہے۔

''دیکھیے! عربی زبان میں مضاف کومقدم ذکر کرتے ہیں اوراردو کا محاورہ یہ ہے کہ مضاف الیہ کومقدم کرتے ہیں۔ وہ''غلامُ زیدٍ'' کہتے ہیں توان کے محاورہ میں''زید کا غلام'' کہیں گے۔ سوترتیب تو بدل گئی مگر دونوں کلمے متصل ہی رہے۔ فاصلہ اورفرق کچھ نہیں ہوا۔ اس لئے حاجت کے وقت یہ تغیر کچھ تغیر نہیں سمجھا جاتا۔ اس قسم کی مثالیں شاہ صاحب کے ترجمے میں کثرت سے ملیں گی۔''(۱۱)

شیخ الہندؒ نے اس ضمن میں ایک مثال عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ (البقرہ/۷)والی آیت سے دی ہے۔ جس کا ترجمہ شاہ صاحب نے یوں کیا ہے۔ ''ان کے دل پراوران کے کان پراورانکی آنکھوں پر''......جبکہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے تحت لفظی میں یوں کیا ہے......''اوپردل ان کے کےاوراوپرکانوں ان کے کےاوراوپرآنکھوں ان کی کے''......۔

ظاہر ہے کہ یہاں معمولی تقدیم وتاخیر کے فرق واختلاف سے بامحاورہ اردو میں بات، بہت جلد قابل فہم ہوگئی ہے۔ سوشاہ صاحب کے ہاں اس طرح کے محاورے بہت ملیں گے اور واضح رہے کہ محاوراتی زبان، ترجمے کا عیب نہیں بلکہ ادائے مفہوم کے لیے ضروری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا حسن بھی ہے۔ اور عاشقوں کو ہمیشہ ایسے ہی حسن کی تلاش رہی ہے۔ اس طرح کے تراجم بامحاورہ ترجمہ کرنے والوں کی مجبوری ہوتے ہیں۔ لیکن شیخ الہندؒ کے بقول:

> ''حضرت شاہ صاحب کی احتیاط قابل تحسین اور لائقِ قدر ہے کہ اس پر بھی ہر جگہ مضاف الیہ کو مقدم نہیں کرتے بلکہ جہاں ترجمے میں ذرا گنجائش مل جاتی ہے۔ وہاں اتنے قلیل تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے، ترتیب قرآنی کو اختیار فرماتے ہیں۔''(۱۲)

شیخ الہندؒ نے اس کی مثال **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** سے دی ہے۔ جس میں ''**رَبِّ الْعٰلَمِیْن**'' مضاف، مضاف الیہ مل کر صفت واقع ہوئے ہیں۔ یہاں چونکہ گنجائش نکل سکتی تھی کہ ترجمہ، محاورہ کے مطابق ہو اور کلامِ الٰہی کی ترتیب بھی باقی رہے۔ سوشاہ صاحبؒ نے **رَبِّ الْعٰلَمِیْن** کا ترجمہ اصلی ترتیب پر باقی رکھا اور آیت کا ترجمہ یوں کیا۔

> ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو پالنے والا سارے جہان کا''۔

اور مالک یوم الدین بھی صفت واقع ہوا ہے۔ مگر چونکہ یہاں دو اضافتیں اکٹھی ہوئی ہیں جس میں پہلی اضافت میں ترتیب اصلی باقی رکھنے کی گنجائش ہے۔ دوسری میں نہیں۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے ''مالک'' کا ترجمہ اصل کے مطابق مقدم کیا۔ اور یوم کے ترجمے کو محاورۂ اردو کے موافق ''دین'' سے مؤخر کیا۔ ان کا ترجمہ یہ ہے...... ''مالک، انصاف کے دن کا'' ...... جبکہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے تحت لفظی کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں کیا ہے...... ''خداوند، دن جزا کا'' ...... شیخ الہندؒ کے بقول شاہ صاحب کے ہاں اس طرح کی تقدیم وتاخیر صرف توضیح اور تسہیل کی غرض سے کی گئی ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بعض ایسے مقامات کہ جہاں محاورۂ اردو کے ساتھ ترتیب قرآنی کا لحاظ رکھنا دشوار تھا۔ وہاں بھی شاہ صاحب نے اس دشوار کو دشوار نہیں رہنے دیا۔ بلکہ اپنی غائر اور باریک بیں نظروں سے ایسا اسلوب اختیار فرمایا کہ محاورہ کی پابندی بھی رہی اور

ترتیب متن بھی باقی رہی اور اگر کوئی فرق آیا بھی تو وہ اتنا معمولی تھا کہ اسے خود "شیخ الہند" نے "خفیف ولطیف" قرار دیا۔ نیز موضح قرآن کے بارے میں شیخ الہندؒ نے لکھا۔

"بعینہٖ یہی حال ہے فعل اور فاعل اور مفعول اور جمیع متعلقاتِ فعل کا اور صفت موصوف، حال تمیز وغیرہ کا کہ اکثر مواقع میں ترتیب کی موافقت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں اسی تغیر لطیف مذکورۂ بالا سے کام لیتے ہیں۔"(۱۳)

کلامِ عرب میں حروفِ روابط یا حروفِ جَر، ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں۔ جبکہ اردو محاورے میں علی العموم مؤخر بولے جاتے ہیں الّا یہ کہ خال خال۔ بلکہ ان میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا مؤخر ہونا لازمی ہوتا ہے۔ جبکہ ہماری زبان میں ان کو مقدم کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ جیسے مِن اور عَن ......اردو زبان میں یہ ممکن ہی نہیں کہ مِن اور عَن کا ترجمہ مقدم ہو سکے۔ جیسے **مما رزقنٰھم** ......اور **لا تجزی نفس عن نفس** میں مِن اور عَن کی مثالیں اس پر شاہد ہیں۔ مگر وہ حروف جنہیں مقدم کرنا درست مگر محاورہ کے خلاف ہے۔ سو تحت لفظی ترجمہ میں ان کو نظم قرآنی کے موافق مقدم کر سکتے ہیں مگر محاورۂ ترجمہ میں انہیں مؤخر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جیسے **علیٰ** اور **الیٰ** وغیرہ......شیخ الہندؒ نے اس کی مثال:

ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم......اور......**الّا علیٰ الخاشعین** سے دی ہے۔

اوّل الذکر آیت کا ترجمہ تحت لفظی میں یوں ہوا ہے۔ "مہر کی اللہ نے اوپر دلوں ان کے"۔ (شاہ رفیع الدینؒ)

اور بامحاورہ ترجمہ اس طرح ہوا ہے......"مہر کر دی اللہ نے ان کے دل پر"......(شاہ عبدالقادرؒ)

اور مؤخر الذکر آیت کا بامحاورہ ترجمہ یوں ہے......"مگر اُنہی پر، جن کے دل پگھلے ہیں۔"

دیکھ لیجیے کہ یہاں علیٰ کے ترجمے کو مقدم رکھا ہے، **خاشعین** پر، اور یہ تقدیم محاورہ کے خلاف بھی نہیں ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں کے بعد شیخ الہندؒ فرماتے ہیں۔

"الحاصل حضرت شاہ صاحب جگہ جگہ ترتیب میں تصرف کرتے ہیں۔

مگر بجا بجا ٹلا بقدرِ ضرورت اور عندالحاجت نہایت غور اور احتیاط کے ساتھ، جس کی وجہ سے حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کا ترجمہ جیسے استعمالاتِ محاورات میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔ ویسا ہی باوجود پابندیٔ محاورہ، قلّتِ تغیّر اور خفتِ تبدّل میں بھی بے مثل ہے۔ فللّٰہ درہ ثم للّٰہ درہ ۔اس کے سوا بعض بعض تصرفات خفیفہ، مفیدہ اور بھی کر جاتے ہیں مثلاً ترجمہ میں کوئی لفظ مختصر بڑھا دیتے ہیں، جس سے مطلب واضح ہو جائے یا مرادِ خداوندی معین ہو جائے۔ سو یہ امر ایسا ہے کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ ایسا ہی ترجمے میں بعض الفاظ کو بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً بعض مواقع میں اِن کا ترجمہ نہیں کرتے۔ یـا بُـنـیَ کے ترجمے میں ''اے میرے باپ نہیں کہتے۔ صرف ''اے باپ'' پرقناعت کرجاتے ہیں۔ یا بُنیّ کا ترجمہ ''اے میرے چھوٹے بیٹے'' کی جگہ فقط ''اے بیٹے!'' فرمایا ہے۔ ایسا ہی یارب کا ترجمہ ''اے رب'' متعدد مواقع میں اختیار فرمایا ہے۔ سو اس قسم کے تصرفات میں کچھ حرج نہیں۔ ترجمۂ لفظی تک میں ان کی گنجائش ہے۔'' (۱۴)

شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے ترجمے میں کن کن امور کا لحاظ رکھا ہے۔ اس کی وضاحت شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمے میں بہت عمدگی اور شانِ جامعیت سے کی ہے۔ جس کا حاصل راقم کی اپنی ترتیب میں کچھ یوں ہے۔

(۱) ترجمہ میں اختصار وسہولت ہے۔ (۲) الفاظ قرآنی میں لفظی ومعنوی موافقت پائی جاتی ہے۔ (۳) صرف لغوی معنی پر بس نہیں کیا گیا ہے بلکہ معنیٔ مرادی اور غرض اصلی کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ (۴) بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ ہے۔ دوسری جگہ کچھ۔ حالانکہ معنیٔ لغوی اس لفظ کے ایک ہی ہیں۔ (۵) سہولت اور وضاحت کی رعایت سے کبھی مضمون ایجابی کو عنوان سلبی میں ادا کیا ہے۔ (۶) نفی اور استثناء کا ترجمہ الگ الگ نہیں کیا بلکہ حصر، جو اس سے مقصود ہے، اس کو محاورے کے موافق بیان کیا ہے۔ (۷) حال، تمیز، بدل وغیرہ حتی کہ مفعول مطلق کے عنوانات کی رعایت کی گئی ہے۔

ان خصوصیات کا اظہار وہی کرسکتا ہے، جو عربی و اردو ہر دو زبانوں کا یکساں اداشناس ہو اور نہ صرف زبانوں کا بلکہ اس طرح کے باریک بین حقائق کے اظہار کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ تبصرہ نگار، قرآنی علوم کا ماہر بھی ہو، اور ساتھ ہی اس کی نگاہ دیگر تراجم پر بھی ہو اور وہ ان تراجم کے معائب و محاسن سے بھی آگاہ ہو۔

دیگر تراجم کے باب میں یہ ظاہر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمے میں، مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تراجم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''احقر نے دونوں ترجموں کو تفصیل سے دیکھا ہے۔ جو ان خرابیوں سے پاک وصاف ہیں اور عمدہ ترجمے ہیں۔'' اسی طرح انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مولانا شاہ رفیع الدینؒ اور مولانا شاہ عبدالقادر قدس اللہ تعالیٰ اسرارھم کے تراجم کو جن شاندار لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ فرماتے ہیں:

> (ان حضرات)'' کے تراجم کو جو غور سے دیکھا تو یہ امر بے تامل معلوم ہوگیا کہ اگر یہ مقدسین اکابر قرآن شریف کی اس ضروری خدمت کو انجام نہ دے جاتے تو اس شدتِ ضرورت کے وقت میں ترجمہ کرنا بہت دشوار ہوتا۔ علماء کو صحیح اور معتبر ترجمہ کرنے کے لیے متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرنا پڑتا اور بہت ہی فکر کرنا ہوتا اور ان دقتوں کے بعد شاید ہی ایسا ترجمہ نہ کرسکتے، جیسا اب کرسکتے ہیں۔'' (۱۵)

اس لیے راقم کا خیال ہے کہ اردو زبان میں جتنے بھی تراجم ہوئے ہیں انہیں اصلاً انہی ابتدائی تراجم کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیے۔ گویا۔

> بجتا ہے آج علم کا جو ساز دوستو!
> وہ بھی اسی جرس کی ہے آواز دوستو!

شیخ الہندؒ نے اپنے حواشی میں متعدد مقامات پر مولانا حافظ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کا بغیر نام لیے ذکر کیا ہے۔ وہ جب ''تراجم دہلویہ'' یا ''تراجم دہلویہ جدیدہ'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ ہوتا ہے۔ (۱۶) جس پر وہ نقد و نظر کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اردو زبان کے معروف تراجم بہ نظر غائر دیکھے تھے۔ وہ

چاہتے تو ان تراجم کو سامنے رکھ کر کچھ لفظوں کے مرادفات میں ردو بدل کر کے ایک نیا ترجمہ بھی کر سکتے تھے وہ علم و فضل کے اس مقامِ رفعت پر فائز بھی تھے کہ اگر پہلے سے کوئی ترجمہ نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اردو کے پہلے ترجمہ نگار بن سکتے تھے۔ ان میں عمدہ مترجم کی تمام تر صلاحیتیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنا ترجمہ کرنے کی بجائے شاہ صاحب کے ترجمے کو فوقیت دی اور اسے اپنے ترجمے کی بنیاد بنایا اس سے ان کی علمی عظمت کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھ گئی۔ کیونکہ انہوں نے شاہ صاحبؒ کے ترجمے کو اپنی ترمیمات کے ذریعے اسے مزید سہل ممتنع بنا کر خوب واضح کر دیا ہے اور حال کا رشتہ ماضی سے جوڑ کر اپنے عہد کے لوگوں کو قرآن فہمی کے لیے خانوادۂ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قریب تر کر دیا ہے۔ اس عظیم کارنامے بلکہ احسان پر وہ دنیائے اسلام بالخصوص دنیائے اردو کی جانب سے دلی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمہ میں مذکورہ بالا چند فوائد کے ساتھ ساتھ چند امثلہ بھی پیش کی ہیں۔ ذیل میں ہم ان میں سے بعض عرض کیے دیتے ہیں۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ شاہ صاحب نے یوں کیا ہے۔ ''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔'' ...... جبکہ شیخ الہندؒ نے الرحمٰن کے ترجمے میں معمولی سی ترمیم کر کے اسے زیادہ مطابق حق وصواب کر دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ...... ''شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔'' ...... اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''رحمٰن اور رحیم دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اور رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے۔ ترجمے میں ان سب باتوں کا لحاظ ہے'' ...... سورۂ فاتحہ میں بھی رحمٰن اور رحیم کا ترجمہ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ شیخ الہندؒ کے بقول:

> ''یوم الدین'' کا ترجمہ جملہ حضرات نے ''روز جزا'' یا ''دن، جزا کا'' فرمایا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صاف لکھ دیا ہے کہ میں نے عوام کی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اور عوام کے کلام میں جزا کا لفظ شائع اور مستعمل نہیں۔ دوسرے اہل لغت اور مفسرین نے دین کے معنی جزا اور حساب دونوں فرمائے ہیں۔ ان وجوہ سے غالباً حضرت ممدوح نے جزاء کے بدلے ''انصاف'' کا لفظ اختیار فرمایا کہ عوام میں بھی شائع ہے اور اس ایک لفظ میں جزاء اور حساب

دونوں آ گئے۔"(۱۷)

مگراس وضاحت کے باوجود خود شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ "روزِ جزا" سے کیا ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم کا ترجمہ شاہ صاحب نے اس طرح کیا ہے....."چلا ہم کوراہ سیدھی۔" شیخ الہندؒ اپنے مقدمے میں فرماتے ہیں:

"ہدایت" کے لغت عرب میں دو معنی ہیں۔ایک صرف "راستہ دکھلا دینا" دوسرے "مقصود تک پہنچا دینا" اول کو ارأۃ اور دوسرے کو ایصال کہتے ہیں۔اس لیے اوروں نے "اھدنا" کا ترجمہ "دکھا ہم کو" فرمایا ہے اور شاہ صاحب "چلا ہم کو" فرماتے ہیں، جس سے "ایصال" کی طرف اشارہ کرنا مفہوم ہوتا ہے۔"(۱۸)

مگر خود شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمے میں شاہ صاحب کی اتباع نہیں کی، اور "چلا ہم کو" کی جگہ "بتلا ہم کو" کے لفظ سے ہدایت کے معنی اول کو اختیار کیا ہے۔

"**ھدی للمتقین**" کا ترجمہ شاہ صاحبؒ نے کیا ہے۔"راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو"۔

شیخ الہندؒ نے اس کی اتباع میں یہاں **ھدیً** کا ترجمہ "بتلانے" سے کیا ہے۔یعنی "راہ بتلاتی ہے، ڈرنے والوں کو۔" اور اپنے مقدمے میں کیا خوب نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔

"اور حضرات نے "**ھدی**" کے ترجمے میں "رہنما" یا "راہ دکھاتی ہے" فرمایا ہے اور حضرت ممدوح نے "راہ بتلاتی ہے" فرمایا ہے۔چونکہ **اھدنا** میں "ہدایت" حق تعالیٰ کی صفت ہے تو وہاں "چلانے" کا لفظ لائے ہیں اور اس موقع میں "ہدایت" قرآن کی صفت ہے۔تو اس لیے "راہ بتانے" کا لفظ بیان فرمایا۔ورنہ دونوں جگہ مقصود ایصال کی طرف اشارہ کرنا معلوم ہوتا ہے۔"(۱۹)

اس نکتہ کی وضاحت کے بعد راقم کا خیال ہے کہ شیخ الہندؒ نے **اھدنا** کا ترجمہ لازماً "چلا ہم کو" سے کیا ہوگا، جو سہو کتابت سے "بتلا ہم کو" ہو گیا ہے۔کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جس بات کو وہ اپنے مقدمے میں بطور وصف کے لائے ہوں۔خود ان کا ترجمہ اس وصف سے خالی ہو۔

اسی طرح ''مالک یوم الدین'' کے ترجمے پر بھی راقم کا یہی خیال ہے کہ شیخ الہند نے اس کا ترجمہ بھی ''مالک روزِ انصاف کا'' سے کیا ہوگا۔مگر کسی تسامح کے سبب وہ بھی ''مالک، روزِ جزا کا'' ہوگیا ہے۔کیونکہ اپنے مقدمے میں انہوں نے ''الدین'' کی وضاحت لفظ انصاف سے کرنے پر شاہ صاحب کی مدح کی ہے اور خود ان کا ترجمہ اس خوبی سے محروم ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ وصف مدح، وقوع مدح کو بھی مستلزم ہوتا ہے اور یہ وہی مقام ہے، جہاں اس لفظ کی ضرورت تھی۔

شیخ الہند نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

> ''ایمان کا ذکر قرآن شریف میں ماضی، مضارع، امر، اسم، فاعل مختلف صیغوں کے ضمن میں بہت کثرت سے موجود ہے۔سو حضرات مترجمین تو اکثر مواقع میں اس کا حسب ظاہر ترجمہ ''ایمان'' یا ''اسلام'' سے فرما جاتے ہیں اور حضرت ممدوح ایمان، اسلام، یقین ماننا، جو لفظ جس موقع کے مناسب اور مفید سمجھتے ہیں، اس کو اختیار کرتے ہیں۔''(۲۰)

اس کی مثال یؤمنون بالغیب کے ترجمے میں موجود ہے۔''جو یقین کرتے ہیں بے دیکھے'' اور دوسری مثال اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ (الانعام/۸۲) کے ترجمہ میں موجود ہے۔شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ بایں الفاظ ادا کیا ہے۔''جو لوگ یقین لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر۔'' اور شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔''جو لوگ یقین لے آئے اور نہیں ملا دیا انہوں نے اپنے یقین میں کوئی نقصان''......اور اس ترجمہ کے حاشیہ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے۔

> ''چونکہ ایمان و شرک کا جمع ہونا بظاہر مستبعد تھا۔اس لیے مترجم محقق قدس سرہٗ نے بغرض تسہیل و تفہیم، ایمان کا ترجمہ یقین سے اور ظلم کا نقصان سے کیا، جو لغت عرب کے عین مطابق ہے۔**کما قولہ تعالیٰ لم تظلم منه شیئا** اور اس نقصان سے مراد شرک میں لیا جائے گا، جیسا کہ احادیث میں تصریح ہوچکی، اور خود نظم کلام میں لفظ ''لبس'' اس کا قرینہ ہے۔اس کی مفصل تحقیق خود مترجم رحمہ اللہ مقدمہ میں فرما چکے ہیں۔وہاں دیکھ لیا جائے۔''(۲۱)

بما کانوا یکذبون...... میں یکذبون کا ترجمہ شاہ صاحب نے کیا ہے۔ ''اس پر وہ جھوٹ کہتے تھے۔'' اس جگہ جھوٹ کہنے اور جھوٹ بولنے میں جو باریک فرق ظاہر کیا گیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''بظاہر اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کا کاذب ہونا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کی وجہ سے ان پر عذاب الیم ہوگا۔ حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ لوگ امنـا باللہ و بالیوم الاخر جھوٹ کہا کرتے تھے یعنی منافق تھے اور عذاب الیم اس نفاق کے بدلے میں ہوگا۔''(۲۲)

اور اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''حضرت شاہ صاحب کو اس باریک فرق پر متنبہ فرمانا منظور ہے، جو یکـذبون کا ترجمہ جھوٹ بولنے کی جگہ ''جھوٹ کہنا'' فرماتے ہیں۔ فجزاہ اللّٰہ ما ادق نظرہ'۔''(۲۳)

شیخ الہندؒ نے جھوٹ کہنے اور جھوٹ بولنے میں جو فرق ظاہر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ترجمے میں یکـذبون کا ترجمہ ''جھوٹ بولنے'' سے کیا ہے اور اس ترجمہ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام گفتگو کا جھوٹ ہوگا، جس پر عذابِ الیم کی وعید آئی ہے، حالانکہ یہ بات سیاق وسباق کے خلاف ہے۔ اور ڈپٹی صاحب نے بھی خود اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''جھوٹ سے مراد وہی اسلام کا غلط دعویٰ ہے، جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کو کرتے تھے۔''(۲۴)

یعنی جو بات انہوں نے حاشیہ میں جا کر صاف کی ہے۔ وہ بات خود ان کے ترجمے میں نہ آسکی۔ جبکہ شاہ صاحبؒ اور شیخ الہندؒ نے اس حقیقت کو اپنے اپنے ترجموں میں خوب سمویا ہے۔

بقرہ کی آیت نمبر۹ اور نمبر۱۲ میں ما یشعرون اور لا یشعرون کے الفاظ آتے ہیں اور دونوں آیتوں میں ''یشعرون'' کا لفظ مشترک (Common) ہے اسی لیے مترجمین حضرات بالعموم دونوں کے ترجمے میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ مگر شاہ صاحبؒ اول الذکر آیت کا ترجمہ ''نہیں بوجھتے'' اور ثانی الذکر کا ترجمہ ''نہیں سمجھتے'' سے کرتے ہیں۔ جبکہ خود شیخ الہندؒ اول الذکر آیت میں ''نہیں سوچتے'' اور مؤخر الذکر آیت میں ''نہیں سمجھتے'' کے الفاظ لائے ہیں اور اپنے حاشیہ قرآن میں لکھا

ہے کہ ''حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ (شاہ عبدالقادر صاحبؒ) کے فہم کی نزاکت ہے کہ یہاں **یشعرون** کا ظاہر ترجمہ چھوڑ کر اس کا ترجمہ بوجھنا یعنی سوچنا فرمایا۔'' (۲۵)

اور اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''جہاں تامل اور فکر کی حاجت ہوتی ہے۔ اس کے سمجھنے کو بوجھنا'' کہتے ہیں۔ حضرت ممدوح کے اس فرق فرمانے سے ادھر اشارہ ہوگیا کہ امر اول یعنی منافقوں کا اپنے نفسوں کو دھوکہ دینا اس کے سمجھنے میں کچھ تامل کی حاجت ہے اور امر ثانی یعنی منافقوں کا مفسد ہونا بالکل ایک امر ظاہر ہے۔ ادنی تامل کی حاجت نہیں۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس موقع میں لا یشعرون کو دو موقعوں میں لانے سے بوجہ اختلاف محل جو باریک فرق نکلتا تھا۔ اس کی طرف اشارہ فرما گئے۔'' (۲۶)

یہاں اس امر کا بیان بےمحل نہ ہوگا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان دونوں مقامات پر ایک ہی لفظ سے ترجمہ کیا ہے۔ یعنی ''شعور نہیں رکھتے''۔ (۲۷) یہ ترجمہ چونکہ شیخ الہندؒ کے ترجمے سے پہلے کا ہے وگرنہ اس لطیف فرق کا حسن ان کے ہاں ضرور آجاتا۔

شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ میں بعض مقامات پر جو ترمیمات و تسہیلات کی ہیں، اس کے اسباب و علل کو راقم اپنے انداز میں لکھتا ہے۔

(۱) موضح قرآن میں امتدادِ زمانہ کے اثر سے کچھ متروکات پیدا ہوگئے تھے۔ جنہیں بدلنا ضروری تھا، شیخ الہندؒ نے انہی متروکات کو بدلا ہے۔ (۲) متروکات کی جگہ الفاظِ مستعملہ کو حضراتِ اکابر کے تراجم سے لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ (۳) کہیں کہیں حسبِ ضرورت اجمال کو کھولا ہے۔ (۴) کچھ جگہوں پر شیخ الہندؒ نے اپنے فکر و خیال سے بھی کوئی لفظ شامل ترجمہ کرلیا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ لفظ سہل، محاورہ کے موافق اور مطابق مدعائے قرآنی ہو۔ (۵) اور جہاں ایسا لفظ نہیں ملا۔ وہاں جانب معنی کو ترجیح دی ہے۔ یعنی لفظ موافق مراد اور مناسب مقام کو اختیار کیا ہے گو اس میں کسی قدر طول ہو یا لفظ بہت مشہور نہ ہو۔ (۶) جس جگہ کسی مصلحت سے ترتیب کو بدلا گیا ہے یا کوئی اور تغیر کیا گیا ہے تو وہاں اس امر کا لحاظ لکھا گیا ہے کہ اس کی نظیر حضراتِ

اکابر کے تراجم میں موجود ہونی چاہیے۔(۲۷) جہاں بعض کلماتِ قرآنی کے ترجمے میں حضرات علمائے کرام کا باہم اختلاف ہوا ہے وہاں شیخ الہندؒ نے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کا اتباع کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی متابعت بھی اختیار کی ہے۔ (۲۸)

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ شیخ الہندؒ کا ترجمہ، اب شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کے ساتھ اکٹھا شائع ہونا چاہیے۔ جس طرح بعض مترجمین کے ترجمے اکٹھے شائع ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً شاہ رفیع الدین دہلویؒ کے ساتھ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ۔ (۲۹) شیخ الہند کو مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمے میں ترمیمات کی ضرورت کہاں کہاں محسوس ہوئی اور کیوں محسوس ہوئی؟ اسے بیک نظر جاننے کے لیے دونوں ترجموں کو ایک ساتھ شائع کرنا ازروئے تحقیق بہت ضروری ہے۔ قرآنیات کے طلبائے تحقیق میں سے اگر کوئی چاہے تو وہ اسے اپنی تحقیق کا عنوان بھی بنا سکتا ہے۔ بالخصوص پی۔ایچ۔ڈی کرنے والا کوئی طالب علم اگر اسے اپنا عنوانِ تحقیق بنائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

حوالہ جات

(۱) ڈاکٹر اسرار احمد، جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، بارِاوّل، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۔ (۲) عبدالحیٔ لکھنوی نزھة الخواطر، جلد۸، ص ۴۶۸، حیدرآباد دکن، ۱۹۷۰ء۔ (۳) ڈاکٹر اسرار احمد، مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق، ص ۷۷، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، بارِششم، ۱۹۸۲ء۔ (۴) ڈاکٹر اسرار احمد، جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی، ص ۱۶۔ (۵) ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآنِ مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ، ص ۴۹، دارالتذکیر، رحمٰن مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۷ء۔ (۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مقدمہ، معارف القرآن، جلد اول، ص ۱۴، مکتبۃ المعارف، دارالعلوم حسینیہ، شہداد پور، سندھ، طبع دوم، ۱۴۴۲ھ۔ (۷) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، جلد اول، تمہید، ص ۶۸۔۶۹، ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی، طبعِ جدید، ۱۹۸۴ء۔ (۸) معارف القرآن از مفتی محمد شفیع کا سالِ تکمیل ۱۳۹۲ھ ہے۔ بحوالہ معارف القرآن، جلد اوّل تمہید، ص ۶۷۔ (۹) معارف القرآن، جلد اول، ص ۶۰۔ (۱۰) مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری، تالیف و تدوین ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، تذکرۂ شیخ الہندؒ، ص ۱۲۸، مجلس یادگار، شیخ الاسلام

پاکستان (کراچی) ۲۰۰۷ء۔ (۱۱) مقدمہ ترجمہ قرآن بہ نام موضح فرقان، ص۳۔ (۱۲) ایضاً۔ (۱۳) ایضاً۔ ص۴۔ (۱۴) ایضاً۔ (۱۵) ایضاً، ص ا۔ (۱۶) دیکھیے حاشیہ زیر آیت الفاتحہ/۷، اور حاشیہ زیر آیت البقرہ ۱۵/ وغیرہ۔ (۱۷) مقدمہ ترجمہ قرآن، ص۵۔ (۱۸) ایضاً۔ (۱۹) ایضاً۔ (۲۰) ایضاً۔ ص۶۔ (۲۱) تفسیر عثمانی، شائع کردہ شاہ فہد قرآنِ کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب، ص۱۸۳، فائدہ نمبر۶، سنہ اشاعت درج نہیں۔ (۲۲) مقدمہ ترجمہ قرآن بنام موضح فرقان۔ ص۶۔ (۲۳) تفسیر عثمانی (حاشیہ شیخ الہند) ص۴۔ (۲۴) ترجمہ مولوی حافظ نذیر احمد، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، لاہور، راولپنڈی، ص۵، فائدہ نمبر۷، سنہ اشاعت ندارد۔ (۲۵) دیکھئے حاشیہ، ص۴، فائدہ نمبر۵، از مولوی نذیر احمد دہلویؒ۔ (۲۶) مقدمہ ترجمہ قرآن بنام موضح فرقان۔ ص۶۔ (۲۷) ترجمہ و مختصر حاشیہ مولانا اشرف علی تھانوی، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور و کراچی، سنہ اشاعت ندارد۔ (۲۸) مقدمہ ترجمہ قرآن بنام موضح فرقان، ص۸۔ (۲۹) عکسی القرآن الحکیم مع ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ و مولانا اشرف علی تھانویؒ، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور و کراچی۔ سنہ اشاعت درج نہیں۔

تذکرہ مفسرین ہند حصہ اول

ڈاکٹر محمد عارف عمری

یہ جلد دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں ہندوستان کے مفسرین شیخ محمد بن احمد شریحی ماریکلی، شیخ نظام الدین الحسن بن محمد نیشاپوری، شیخ ابوبکر اسحاق بن تاج ملتانی، شیخ محمد بن یوسف حسینی گیسودراز، شیخ علی بن احمد مہائمی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی، حاجی عبدالوہاب نجاری، شیخ حسن محمد احمد آبادی گجراتی، شیخ مبارک ناگوری، شیخ یعقوب صرفی، شیخ ابوالفیض فیضی، شیخ منور بن عبدالحمید لاہوری، شیخ غلام نقشبند گھوسی، ملا جیون امیٹھوی وغیرہ اور دوسرے حصہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر مولانا قطب الدین دہلوی تک کے سوانح اور ان کی تفسیروں کا تعارف، نیز ان کے علاوہ، معاصرین کی تفسیری کاوشوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

قیمت =/۹۵ روپے

عربی علوم وآداب کے فروغ میں علمائے کشمیر کا حصہ

ڈاکٹر فردوس نذیر بٹ

برصغیر ہند و پاک میں خورشید اسلام کی تابناک شعاعیں پہلی صدی ہجری میں اس وقت سے پھوٹنی شروع ہوگئیں جب مسلم فوج کے سپہ سالار محمد بن قاسم ثقفی نے ۷۱۲ء میں راور کی جنگ میں راجہ داہر اور اس کے بیٹے جے سنگ کو شکست دے کر سندھ پر اپنی فتح کا جھنڈا نصب کیا، محمد بن قاسم تین سال تک سندھ کا والی رہا، چنانچہ اس عرصہ میں سندھ سے لے کر ملتان کا پورا علاقہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوگیا، بہت جلد اس خطے میں اسلام کی روشنی پھیلنے لگی جس کے نتیجہ میں لوگوں نے بت پرستی اور توہم پرستی سے نکل کر توحید اور رسالت کو گلے لگایا، عربوں نے مفتوحہ علاقوں میں مدارس و مساجد کی تاسیس کی، جس نے اسلامی علوم و معارف، قرآن، حدیث، فقہ، عربی لغت کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار نبھایا، چنانچہ تاریخ اسلام کا یہی وہ دور ہے جب ہندوستان میں عربی تہذیب و ثقافت، علم و ادب کی داغ بیل پڑی جس کے اثرات بہت جلد وادی کشمیر کی سرزمین پر بھی ظاہر ہوئے۔ چچ نامہ کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان محمد بن قاسم اور عرب و شام کے امراء کے ہاتھوں فتح ہوا، اسی زمانے میں اسلام یہاں پھیل گیا اور دریائے محیط سے لے کر قنوج اور کشمیر کے حدود تک مسجدوں اور منبروں کی تعمیر عمل میں آئی''۔

وادی کشمیر کے اندر اگرچہ عربی علوم و فنون کی نشو و نما پہلی صدی ہجری میں ہی فتح سندھ کے ساتھ ہوئی مگر یہ کام آٹھویں صدی ہجری میں باقاعدہ اس وقت شروع ہوگیا جب وسط ایشیاء، ایران اور افغانستان سے ترک وطن کرنے والے مسلم مہاجرین نے اس سرزمین کو اپنی آماجگاہ

خانقاہ باغ پانپور، کشمیر۔

بنا کر اس کے طول و عرض میں دعوت و تبلیغ، تعلیم و تدریس اور قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت کا آغاز کیا جس کے نتیجہ میں بہت جلد یہاں کی اکثریت اپنے آبائی ادیان اور مذہبی عقائد سے آزاد ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوگئی، مبلغوں اور مصلحوں کے اس قافلہ میں میر سید علی ہمدانی کا نام سرفہرست ہے، وہ اعلیٰ صفت، تقوی شعار اور عبادت گزار ہونے کے علاوہ ایک متبحر عالم دین تھے، وہ ۱۳۷۲ء/۷۷۴ء میں اپنے رفقائے کرام کی معیت میں کشمیر تشریف لائے اور یہاں دعوتی و اصلاحی مقاصد کے پیش نظر رہائش اختیار کی، اس مدت قیام میں انہوں نے عربی زبان میں کئی کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں ''اورادفتحیہ''، ''المودۃ فی القربیٰ''، ''کتاب السبعین''، ''علم القیافۃ''، خلاصۃ المناقب''، ''روضۃ الفردوس''، ''فردوس الاخیار'' جیسی کتابیں شامل ہیں۔

ان میں ''اورادفتحیہ'' کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، یہ کتاب قرآن وحدیث سے مستنبط ذات باری تعالیٰ کے اسماء وصفات، توحید وربوبیت پر مشتمل اذکار و وظائف کا مجموعہ ہے، مورخین کے مطابق میر ہمدانی نے اورادفتحیہ اس وقت تالیف کی جب وادی کی اکثریت پر ہندو مت کا غلبہ تھا، لوگ ''رام'' کی پوجا کرتے تھے اور صبح صادق اس کی بھگتی میں بآواز بلند بھجن گایا کرتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی نماز فجر مختل ہوجاتی تھی، چنانچہ اس چیز سے متاثر ہو کر میر ہمدانی نے ''اورادفتحیہ'' تالیف کی اور اسے مساجد کے اندر وقت سحر پڑھنے کا رواج دیا۔ وادی کے اندر اس کتاب کی مقبولیت اس قدر عام ہے کہ ناخواندہ بھی اس کے جواہر پاروں کو ازبر کرنے اور انہیں پڑھنے کا خاصا اہتمام کرتے ہیں، کتاب اپنے اسلوب میں دلکش اور عمدہ ہونے کے علاوہ جامع اور مستند نصوص پر مبنی ہے، چنانچہ ذات باری تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات کے ضمن میں یہ اوراد لکھے گئے:

''لا الہ الا اللہ قبل کل شیء، لا الہ الا اللہ بعد کل شیء، لا الہ الا اللہ یبقی ربنا ویفنی و یموت کل شیء، لا الہ الا اللہ الملک الحق المبین، لا الہ الا اللہ الملک الحق الیقین، لا الہ الا اللہ العلی العظیم، لا الہ الا اللہ الحلیم الکریم، لا الہ الا اللہ رب السماوات السبع و رب العرش العظیم، لا الہ الا

اللہ اکرم الاکرمین ، لا الہ الا اللہ ارحم الراحمین ، لا الہ الا اللہ حبیب التوابین ، لا الہ الا اللہ راحم المساکین ، لا الہ الا اللہ ھادی المضلین ، لا الہ الا اللہ دلیل الحائرین ، لا الہ الا اللہ امان الخائفین ، لا الہ الا اللہ غیاث المستغیثین" الخ۔

میر سید علی ہمدانی کشمیر میں اسلامی تہذیب وثقافت کے اولین بانی، مصلح ومبلغ، فارسی و عربی زبان کے ادیب اور شاعر تھے، علامہ اقبال نے ان کی عہد ساز شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے معمار تقدیر امم سے تعبیر کیا:

سید السادات سالار عجم　　دست او معمار تقدیر امم

مرشد آن کشور مینو نظیر　　میر درویش و سلاطین رامشیر

خط را آں شاہ دریار آستین　　داد علم وصنعت و تہذیب دین

یہ بات قابل ذکر ہے کہ میر سید ہمدانی کے رفقائے کرام جو ترک وطن کر کے کشمیر وارد ہوئے وہ صاحب علوم قرآن وحدیث تھے، انہوں نے وادی کے گوشے گوشے میں قرآن وسنت کی تعلیمات کو عام کرنے میں اپنا فعال کردار نبھایا۔ کتاب اللہ اور حدیث رسول کا سر چشمہ عربی زبان ہونے کی وجہ سے بہت سی عربی تعبیرات اور اصطلاحات یہاں کی علاقائی زبانوں میں رائج ہوگئیں جن میں صوم وصلاۃ، کفر وایمان، جنت وجہنم، زکاۃ وحج، بغض وعداوت، منافق وحاسد، رکوع وسجود، فرض وسنت، واجب ونفل، قبر وحشر، قبلہ وکعبہ، علم وعمل، بخل واحسان، عبادت و اطاعت، غیبت وشفاعت، وصیت ومنت، ہدایت وضلالت، برکت ورحمت، حکمت وجہالت، صبر وشکر جیسے الفاظ شامل ہیں۔ میر سید ہمدانی اور ان کے مخلص رفقاء کی داعیانہ کاوشوں سے وادی کشمیر میں علوم ومعارف کی تخم ریزی کا نتیجہ ہے کہ ان کے بعد کشمیر میں علماء ومحدثین وفقہاء، اور ایسے ارباب شعر وسخن پیدا ہوئے جنہوں نے علم ودانش کے میدان میں اپنے بیش قیمت علمی و فکری جواہر بکھیرے جن کی آب وتاب مرور زمانہ کے باوجود آج بھی قائم ہے۔ ان میں شیخ یعقوب صرفیؒ، شیخ حبیب اللہ نوشہریؒ، شیخ معین الدین نقشبندیؒ، ابوالوفاء امرتسریؒ، عبدالرشید شوپیانیؒ، ملا نازک، شیخ احمد الواعظؒ، محمد یوسف تارہ بلیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، سید میرک شاہ

کشمیریؒ، قاسم شاہ بخاریؒ، محمد یوسف شاہ کشمیریؒ، امین الواجدیؒ وغیرہ جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ گاہے گاہے بازخواں کے مطابق ان حضرات کی عربی خدمات کا محض مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) شیخ یعقوب صرفیؒ (۹۲۸ھ): میر سید علی ہمدانی کے بعد وادی کی سرزمین میں علوم عربیہ کی نشر واشاعت میں علامہ شیخ یعقوب صرفی کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم، محدث، فقیہ اور مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے، صاحب نزھۃ الخواطر کے مطابق وہ علوم ومعارف کے مینار، اسرار وحقائق دینیہ کے شہسوار اور زمانے کے لیے باعث افتخار تھے، جن کی مثال عربی زبان وادب، شعر وسخن، عروض، قافیہ، لغت، تاریخ، اور علم طب میں ملنی محال ہے۔(۲)

صرفی کی پیدائش ایک معزز دینی گھرانے میں ہوئی، ان کے والد میر حسن بھی بلند پایہ عالم دین تھے جنھوں نے بچپن ہی سے صرفی کی تعلیم وتربیت کا غیر معمولی اہتمام کیا، چنانچہ اسی حسن تربیت کا ثمرہ تھا کہ صرفی نے سات سال کی عمر میں حافظ قرآن ہونے کا شرف حاصل کیا، ابتدائی تعلیم وقت کے موقر عالم دین ''ملا آنی'' سے حاصل کی، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے سمرقند کا سفر کیا جہاں شیخ حسین خوارزمی سے کسب فیض کر کے علوم دینیہ میں درک اور کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد حجاز کا سفر کیا جہاں ابن حجر مکی جیسے محدث شہیر سے علم حدیث کی تعلیم پائی، بہت جلد وقت کے باوقار اہل علم کی صف میں اپنی شناخت قائم کی اور علم ودانش کے میدان میں بلند ترین مقام حاصل کیا۔ ان کے شاگردوں میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کا نام بھی ہے۔

شیخ صرفی نے عربی میں متعدد کتب ورسائل، شروح کے علاوہ کئی کتابوں کے حواشی، تقاریظ اور تعلیقات لکھے ہیں، ان میں چند اہم نام درج ذیل ہیں:

۱-''مطلب الطالبین فی تفسیر کلام رب العالمین'': یہ کتاب قرآن پاک کی سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ بقرہ آیت ۶۱ تک کی تفسیر ہے، مصنف نامساعد حالات کے سبب اس تفسیر کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ مصنف نے بیضاوی، کشاف اور زجاج کے تفسیری منہج کا تتبع کیا ہے۔

۲-''لغۃ الشمائل'': یہ کتاب شمائل رسولؐ کے ضمن میں وارد ہونے والے مشکل الفاظ پر

مبنی ایک مختصر رسالہ کی صورت میں ہے۔

۳-تقریظ "سواطع الالہام" : یہ کتاب ابوالفیض فیضی کی تفسیر "**سواطع الالہام**" پر مصنف کی تقریظ ہے، یہ نثر کے علاوہ عمدہ شعری جواہر پاروں سے مرصع ہے۔اس تقریظ کو فیضی نے مکمل طور پر اپنی تفسیر کے آخر میں شامل کیا ہے۔

مذکورہ کتب کے علاوہ ان کی تصانیف میں "**تعلیقات علی التلویح**"، "**رسالۃ فی المقامات**"، "**لیلی و مجنون**"، "**مسلک الأخیار**"، "**مغازی النبوۃ**" جیسی کتابیں شامل ہیں۔

صرفی نے شعروادب میں بھی طبع آزمائی کی، وہ فارسی اور عربی کے بلند پایہ شاعر تھے، فارسی میں ان کا مکمل شعری مجموعہ چھپ کر شائع ہوا ہے،صرفی اپنی شاعری میں قدیم شعراء کے اسلوب کے پابند ہیں، ان کی شاعری میں خیال آفرینی اور دقت پسندی نمایاں ہے، الفاظ میں برجستگی اور غنائیت ہے،صرفی کی شاعری کا جو حصہ ہم کو دستیاب ہے اس میں وہ اشعار شامل ہیں جو انہوں نے فیضی کی تفسیر پر مدح کی صورت میں کہے ہیں،ان میں چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

یا من هو قد جل تعالی شانا أنزلت علی نبینا قرآنا

فاخترت بأفضالک من فسّره وامتاز بکشف سره تبیانا

یامن بسر الوحی أنت الأعلم قد جاء نا منک الکتاب المحکم

یامن بفیض کامل خصصت من علمته ما لم یکن هو یعلم

أهل الهدی ما هم اهتدوا إلا به ما ضل إلا ظالم بل أظلم

ترجمہ: اے وہ ذات جو کہ بلند شان وعظمت کی مالک ہے،آپ نے ہمارے نبیؐ پر قرآن نازل کیا،اور اس کی تفسیر کے لیے اپنے برگزیدہ بندوں میں ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس نے اس کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا اوراس کے حقائق کھول کھول کر بیان کردیے،(اے نبیؐ) آپ ہی وحی کے پوشیدہ راز سے باخبر ہیں،آپ کی وساطت سے ہمارے پاس کتاب محکم (قرآن) پہنچا ہے،آپ کی ذات عالی کو ہی فیض کامل کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور آپ کو وہ کچھ سکھایا گیا ہے جس کا کسی کو علم تک نہیں، یہ کتاب ہی وہ کلام ہے جس سے ہدایت مندوں کو ہدایت کا رستہ ملا ہے اور ظالمین ہی (اس کے نور سے محروم ہوکر) گم راہ ہوئے۔

صرفی کی شاعری میں سب سے دلکش ان کی وہ غزلیں ہیں جن کا ایک مصرع عربی اور دوسرا فارسی میں ہے، اس نوعیت کی ایک غزل کے چند ابیات درج ذیل ہیں:

حببت حبا سلبت عقلا غلبت شوقا لوصل سلمی
کہ میتواند خبر رساند آں پری وش زحالت ما
سلبت عقلی نهبت قلبی فأنت حلی وأنت حبی
بخوب رویانِ دیگر اکنون چکار دارم تو خود بفرما
جرت دموعی علی خدودی فهذه بالهوی شهودی
گواہِ عالم ببین و رحمے بحالِ ایں دلِ شکستہ فرما

مجھے محبت عطا ہوئی اور عقل سلب ہوگئی اور سلمی کی ملاقات کا شوق دامن گیر ہوگیا، اب کون ہے جو میری خوب رو محبوبہ کو میری حالت زار سے آگاہ کردے، اے محبوبہ! تو نے ہی میری عقل کو مجھ سے چھینا، میرے دل کو غارت کردیا، اب تو ہی میری آبرو اور آرزو ہے، بھلا تجھے چھوڑ کر اب باقی حسیناؤں کی طرف مائل ہونا کہاں ممکن ہے، میرے آنسو جو میرے رخسار پر بہتے ہیں یہی میری سچی محبت پر گواہ ہیں، بس تو ہی میرے حال کا مشاہدہ کرکے میرے مصیبت زدہ دل پر ترس کھا۔

(۲) شیخ حبیب اللہ حبی نوشہریؒ (۹۶۳ھ): شیخ حبیب اللہ نوشہری کا شمار فارسی زبان کے نامور شعراء اور اہل فن میں ہوتا ہے، ان کی پیدائش نوشہرہ سری نگر میں ۹۶۳ء کو ہوئی۔ بچپن سے ہی ذہانت وفطانت اور تقوی و پاکیزگی کی اعلی صفات سے متصف تھے۔ والد ماجد علاقہ کے ایک ممتاز و معروف تاجر تھے لہٰذا انہوں نے بھی ابتداء میں تجارت کو بطور پیشہ اپنایا کی وادی میں خیمہ زن ہوئے، مگر مشیت ایزدی کے مطابق بہت جلد اس سے الگ ہوکر علم وعرفان اور وقت کے جلیل القدر صوفیہ اور علماء کی صحبت اختیار کرکے علم ودانش کے میدان میں نام کمایا، ان میں ملا محمد آفاقی اور مجدد ملت شیخ علامہ یعقوب صرفی قابل ذکر ہیں، شیخ صرفی کی رفاقت نے حبی کی فکر ونظر پر گہرے اثرات چھوڑے، ان کے فیضان صحبت کا ہی اعجاز تھا کہ حبی گم نامی سے نکل کر شہرت کے منظر پر ابھرے اور عام وخاص کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

ان کی فارسی منظوم تصانیف میں مرآۃ القلوب، تنبیہ القلوب، وصیت نامہ صرفی، دیوان حبی

وغیرہ شامل ہیں، شیخ حبیب اللہ نے فارسی کے علاوہ عربی زبان وادب میں بھی خامہ فرسائی کی "رسالة السلوک" کے نام سے ان کی ایک کتاب ملتی ہے جو اپنے اسلوب وموضوع کے اعتبار سے عربی زبان کا ایک عمدہ نثری شہ پارہ شمار ہوتا ہے۔

عربی ادب میں جبی کی سب سے نمایاں خدمت ان کے وہ عربی قصائد ومنظومات ہیں جو ان کی تصانیف اور شعری دواوین میں بکثرت موجود ہیں، جبی نے اپنے استاذ ومرشد شیخ یعقوب صرفی کے منہج واسلوب کی اتباع میں متعدد ایسی غزلیں اور قصائد مرتب کیے ہیں جن میں ایک مصرع عربی تو دوسرا فارسی میں ہے اور موصوف کی فنکاری، حسن ذوق اور برجستگی پر دلیل ہیں۔ ڈاکٹر محمد فاروق بخاری کے مطابق جبی کی سب سے مشہور عربی نظم ان کی مثنوی "الانصاف في بيان طريقة النجاة" ہے جو عشق ومحبت اور اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ رنج والم کی تعبیر پیش کرنے کے علاوہ تصوف اور اس کے اہم سلسلوں کی خصوصیات اور خوبیوں پر روشنی ڈالتی ہے، ڈاکٹر حامد علی صاحب کے بقول جبی کی یہ نظم ہندوستان میں پہلی عربی مثنوی ہے (۳)، اس کے چند ابیات بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

مذهب العشق مذهب واحد إذهب إذهب عليه يا زاهد

ليس للعقل اجتهاد فيه ليس للنقل اعتماد فيه

إنما الحال ههنا منظور إنما القال ههنا مهجور

ترجمہ: اے زاہد! عشق ومحبت کا ایک ہی مذہب ہوتا ہے جو تیری سمجھ سے ماوراء ہے لہٰذا اس سے دور ہی رہو، اس کو سمجھنے کے لیے ذہنی مجاہدہ مطلوب نہیں، اور نہ ہی اس کے لیے نقل پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، اس میں قول وقال کے بجائے صرف حال اور جذبے کو قبول کیا جاتا ہے۔

ایک اور غزل میں محبوب سے شدت تعلق کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حبيبي إليک حشائي مشي فأين المرام و أين الحشا

يراک الحشا با لغدو والعشا فنعم العدا و نعم العشا

لديک جناني لدى الهموم عسى أن يلي مهجتي إن تشا

میرے محبوب میرا دل تیری جانب چلنے لگا ہے، مگر کہاں منزل مقصود اور کہاں میرا دل، ہر صبح وشام میرا

دل تیرے دیدار سے بہرہ ور ہوتا ہے، تو کیا ہی عمدہ وہ صبح ہوتی ہے اور کیا ہی عمدہ وہ شام ہوتی ہے، میرا دل تیرے پاس اسیر ہے جب کہ میرے پاس غم واندوہ کے سوا کچھ نہیں، اگر تو چاہے تو شاید یہ دل اپنی مراد پانے میں کامیاب ہوجائے۔

(۳) عبدالرشید شوپیانیؒ (۱۲۹۸ھ): وادی کشمیر کے شوپیان علاقے نے جہاں اپنی زرخیز مٹی سے خوش رنگ وخوش ذائقہ سیب پیدا کیے وہیں علم وادب اور حکمت و دانش کے چمن بھی کھلائے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کشمیر کی علمی وادبی تاریخ میں عبدالرشید کی شخصیت کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ صاحب ''**نزهة الخواطر**'' مولانا عبدالحئی حسنیؒ ان کی وسعت علمی، کمال فن اور ادبی مقام کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''**الشيخ الفاضل عبدالرشيد بن محمد شاه الشوبياني أحد العلماء المبرزين في النحو واللغة ...... وكان بارعا في المعارف الأدبية، شاعرا حسن المحاضرة**''۔(۴)	شیخ عبدالرشید بن محمد شاہ شوپیانی عربی لغت و نحو کے ایک ممتاز عالم تھے، علوم ادبیہ میں ان کو مہارت اور فن شعر میں دسترس حاصل تھی۔

عبدالرشید کے ابتدائی حالات زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں، مورخین کے مطابق ان کی ولادت ضلع شوپیان کے اندر ایک سلفی خانوادے میں ہوئی، سلفی فکر سے اپنی گہری وابستگی کے نتیجہ میں انہوں نے نواب صدیق حسن خان سے ملاقات کی غرض سے بھوپال کا سفر کیا، ایک مدت تک ان کی رفاقت میں رہ کر ان کے گنجینہ علم و ہنر سے مالا مال ہوئے، نواب صاحب نے ان کو افتاء کے عہدہ پر فائز کیا اور اپنا خاص معاون ہونے کا شرف عطا کیا، نواب صاحب کی وفات کے بعد شوپیانی نے ان کی کتاب ''**ظفر اللاضی**''، پر تقریظ لکھی جس کو علمی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

شوپیانی خالص صاحب فکر عالم تھے، دین میں اجتہاد وتجدید کے قائل تھے اور تقلید کے مخالف تھے، دینی علوم میں یدطولی اور گہری بصیرت کے مالک تھے، ان کی متعدد کتابیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں جن میں درج ذیل اہم ہیں:

۱-"**آیات الاعجاز**": یہ کتاب اعجاز قرآن سے متعلق مصنف کی ایک اہم بحث ہے، جو قرآن کے اعجاز پر گفتگو کے ساتھ اسباب نزول قرآن پر بھی روشنی ڈالتی ہے اور اس موضوع پر وسیع مواد فراہم کرتی ہے، کتاب کا اسلوب عمدہ اور بیان دلکش ہے۔

۲-"**المقدمة لسنن الدارمی**": سنن دارمی پر مصنف کا یہ مقدمہ فن حدیث اور اصول حدیث کے موضوع پر موصوف کی گہری معرفت کا بین ثبوت ہے۔ مصنف نے مقدمہ میں علم کی فضیلت اور علماء کے مقام و مرتبت پر گفتگو کی ہے، مقدمہ کے آخر میں امام دارمیؒ کے حالات زندگی اور مذکورہ کتاب کی فضیلت اور عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔

۳-ختام"**ظفر اللاضی بما یجب فی القضاء علی القاضی**": یہ کتاب عدالتی امور کے متعلق نواب صدیق حسن خان کی مشہور تالیف ہے جو ان کی وفات کے بعد ان کی زوجہ ملکہ نواب شاہ جہاں بیگم اور ان کے فرزند نے شائع کی، عبدالرشید شوپیانی نے اس کتاب کا تکملہ لکھ کر اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

۴-"**نزل من اتقی**": یہ مجدالدین ابن تیمیہ کی کتاب "**المنتقی من احادیث الاحکام**" پر مصنف کا مقدمہ ہے جو انہوں نے نواب صدیق حسن خان کے ایما پر لکھا ہے۔

عربی نثر میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا، ان کی نثر نگاری پر علم بدیع کا رنگ نمایاں ہے، جو مسجع اور مقفی عبارتوں سے مزین ہے اور قدیم کلاسیکی اسلوب کے تابع ہے، ان کی نثر کا ایک اقتباس بطور نمونہ پیش ہے جو ان کی مہارت اور حسن ادا سے عبارت ہے۔

> "**فلما ابتلیت بنیابة عهدة الافتاء ببلدة بوفال المحمیة هتفت بی ریح القضاء الی اختیار الطویة و نیطت علی عمائم القیام بحقوقها و میطت عنی تمائم الطمانینه بما فی خلب بروقها ، فأغضیت الأجفان علی قذاها وطویت الأحشاء علی تعبها و أذاها وجعلت کلما جرت علی لسانی کلمة تأسفیة أتمثل بقول القائل المبتلی بهذه الرزیة ، ذبحت نفسک لا بسکین**"۔

شوپیانی نے فن شعر میں بھی اپنے جوہر دکھائے اور اس میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادرالکلامی

کا ثبوت فراہم کیا، ان میں قابل ذکر وہ اشعار ہیں جو انہوں نے نواب صدیق حسن خان کی تالیف "ظفر اللاضی" پر تقریظ کی صورت میں لکھے ہیں اور حمد وثنا اور درود وسلام سے متعلق ہیں، ان میں چند اشعار درج ذیل ہیں:

باسم الإله العالمين أبتدی وبسنا نور هداه أقتدی

سبحانک اللهم لا نحصی الثنا علیک ما عجز عنه الألسنا

ثم صلاة اللّٰه والتسليم علی نبی هديه قويم

محمد ماحی ظلام الکفر عن ساحة الدنيا بنور الذکر

ترجمہ: میں دو جہاں کے مالک کے نام سے شروع کرتا ہوں اور اس کے نور ہدایت کی پیروی کرتا ہوں، اے اللہ تری ذات مقدس ہے جس کی ثنا کا ہم احصا نہیں کرسکتے اس سے ہماری زبانیں عاجز اور قاصر ہیں، اس کے بعد درود وسلام ہو اس نبیؐ پر جن کی ہدایت مستحکم اور پائیدار ہے، جنہوں نے دنیا میں سے قرآن کے نور سے کفر کی ظلمتیں دور کردیں۔

(۴) علامہ انور شاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲-۱۳۵۲ھ): علامہ انور شاہ کشمیری کی شخصیت نہ صرف وادی کشمیر اور برصغیر ہند و پاک بلکہ عالم اسلام کی ممتاز، علمی و دینی شخصیت کے طور پر یاد کی جاتی ہے، وہ اپنے زمانے کے نابغہ روزگار فقیہ، جید محقق، عظیم دانشور، نامور صاحب قلم، صاحب طرز ادیب وشاعر، علم تفسیر وحدیث کے ماہر، اور عربی زبان ولغت کے عبقری عالم تھے۔ وہ اپنی ذہانت وفراست اور قوت حفظ میں یکتا اور وسعت معلومات میں بے مثل تھے، ان کے تبحر علمی، جامع کمالات وخصوصیات اور علمی کارناموں کی بدولت انہیں اپنے دور کا غزالی اور رازی قرار دیا گیا۔ اہل علم نے ان سے کسب فیض کرنے کے علاوہ ان کے بلند مقام ومرتبت کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں انور شاہ اس بحر بیکراں کے مانند ہیں جو ظاہر میں پرسکون ہے لیکن تہہ میں بیش قیمت موتیوں سے معمور ہے، مشہور محدث علی حنبلی لکھتے ہیں کہ میں نے انور شاہ جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا جو کہ امام ابن تیمیہؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، ابن حزمؒ اور شوکانیؒ کے مقام کی رعایت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات کو جمع کرنے اور ان کے درمیان عدل اور تحقیق کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا اہل ہو، علامہ انور شاہ کی عظمت کا ہی یہ اعتراف تھا کہ مصر کے مشہور عالم دین

سید رشید رضا نے ان کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد کہا کہ ''**ما رأیت مثل ھذا الأستاذ الجلیل**'' میں نے اس بلند پایہ استاذ کے جیسا کوئی نہ پایا۔(۵)

انور شاہ کی پیدائش ۱۲۹۲ھ میں بمقام ''لولاب'' ایک علمی گھرانے میں ہوئی، ان کے والد بزرگوار معظم شاہ ایک معزز اور نامور عالم دین تھے جن کے منبع علم و ہنر سے ہزاروں اہل علم مستفید ہوئے تھے، شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم، قرآن وحدیث کے دروس، فقہ اور عربی و فارسی زبان کے اصول و مبادی اپنے والد سے ہی حاصل کیے، سن رشد کو پہنچنے پر بغرض اعلیٰ تعلیم پنجاب چلے آئے جہاں وقت کے جید علماء اور اہل دانش سے فیض حاصل کیا، اس کے بعد حصول علم کی مزید جستجو اور طلب نے دارالعلوم دیوبند کی طرف رہنمائی کی جہاں ممتاز علماء اور جلیل القدر اساتذہ کی علمی رہنمائی اور صحبت پائی ان میں شیخ الہند محمود الحسن اور شیخ رشید احمد گنگوہی قابل ذکر ہیں، دیوبند سے فراغت کے بعد دلی کے ''مدرسۃ امینیہ'' میں بطور مدرس تعین ہوا، چار سال یہاں قیام کے بعد وطن واپس آئے جہاں ''فیض عام'' کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، اس کے بعد حجاز کا سفر کیا اور شیخ حسین بن محمد طرابلسی جیسے ممتاز عالم کی شاگردی اختیار کر کے علم حدیث میں درک اور کمال حاصل کیا، حجاز سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند کا قصد کیا جہاں صدر مدرسین کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، ایک مدت تک اس منصب پر فائز رہے، ۱۳۵۲ھ بمطابق ۱۹۳۳ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

شاہ صاحب تصنیف و تالیف، تحقیق و تدقیق میں بے نظیر تھے، عربی علوم و آداب پر غیر معمولی دسترس تھی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مطابق برصغیر میں علوم عقلیہ و نقلیہ میں انور شاہ کا کوئی مد مقابل تھا اور نہ حجاز، شام و عراق میں ان کا کوئی ثانی۔

علامہ انور شاہ عربی زبان کے یگانہ روزگار عالم اور ممتاز ادیب تھے، ان کی تحریریں فقہ، حدیث، عقائد، تفسیر، مسائل، منطق جیسے موضوعات کے علاوہ عربی شعر و ادب کی بھی آئینہ دار ہیں، ان کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) إکفار الملحدین شئ من ضروریات الدین (۲) تعلیقات علی فتح القدیر (۳) تعلیقات علی صحیح مسلم (۴) تعلیقات علی الأشباہ

والنظائر (۵) مشکلات القرآن (۶) نیل الفرقدین فی مسألة رفع الیدین (۷) فیض الباری شرح صحیح البخاری (۴ مجلدات) (۸) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح (۹) العرف الشذی من جامع الترمذی (۱۰) فصل الخطاب فی مسألة أم الکتاب (۱۱) أمالی علی سنن أبی داود (۱۲) العرف الشذی من جامع الترمذی (۱۳) کشف الستر عن مسألة الوتر (۱۴) بسط الیدین لنیل الفرقدین (۱۵) خاتمة الخطاب فی فاتحة الکتاب (۱۶) تحیة الاسلام فی حیاة عیسی علیه السلام (۱۷) عقیدة الاسلام فی حیاة عیسی علیه السلام (۱۸) ضرب الخاتم علی حدوث العالم (۱۹) خزائن الأسرار وغیرہ۔

شاہ صاحب ہزاروں اشعار کے حافظ تھے اور سینکڑوں قصائد ان کی یادداشت میں محفوظ تھے، علامہ فطرت پسند شاعر تھے، ان کی شاعری میں جذبات کی گہرائی، احساسات کی کثرت، معانی کی لطافت کے علاوہ کلاسیکی اسلوب کی تقلید نمایاں ہے، ان کے شعری موضوعات میں حکمت، امثال، حقائق، معارف، مدح کے علاوہ مرثیہ شامل ہیں، ڈاکٹر فاروق بخاری کے مطابق شاہ صاحب کی شاعری تین حصوں میں منقسم ہے:

اول: وہ شاعری جو اکثر مرثیہ کی صورت میں ہے اور عمیق جذبات اور گہرے عواطف سے مملو ہے۔

دوم: وہ شاعری جو کہ حماسی شاعری سے مشابہت رکھتی ہے اور شاعر کے ملی جذبات اور دینی حمیت کی تعبیر پیش کرتی ہے۔

سوم: وہ شاعری جو خالص علمی اور فکری مسائل پر مبنی ہے اور شاعر کے ذخیرہ اشعار میں مقدار کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہے۔(۶)

ان کی شاعری کے متعدد قصائد مدح کی صورت میں مشائخ اور اساتذہ کے لیے خاص ہیں، چنانچہ ایک جگہ اپنے استاذ شیخ الہند محمود الحسن کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

إذا جئته وافیته مهللا　　کبدر مبین من جبین وأوسعا
وغرته سیما السجود وبشره　　تباشیر صبح أو کمسک تضوعا

جب تم ان کے پاس جاوگے تو ان کی پیشانی کو چمکتا ہوا پاوگے گویا وہ اپنی چمک دمک میں چودھویں کا چاند ہو، اس کی پیشانی کا نور اس کے سجدوں کے نشان ہیں، اس کی خندہ روئی صبح کی رونق یا مہکتی خوشبو کا جھونکا ہے۔

(۵) سید میرک شاہ کشمیریؒ (۱۳۰۶ھ): وادی کشمیر میں اشاعت توحید، تجدید ملت، احیاء کتاب وسنت اور علوم عربیہ کی خدمت کے باب میں ایک نمایاں نام سید میرک شاہ کشمیری کا ہے، ان کا شمار انور شاہ کشمیری کے نامور طلبہ میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو گونا گوں صفات وکمالات سے نوازا تھا، وہ حسن اخلاق، حسن کردار اور حسن معاملات میں ایک مثالی انسان تھے تو ایک ممتاز عالم دین اور عربی زبان وادب کے متبحر و ماہر استاذ بھی تھے، ڈاکٹر مظفر حسین ندوی ان کی ہمہ گیر علمی وفکری شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

”وهو مترجم قدير، وعروضي شهير، وداع كبير، وحام عن حوض الاسلام، وشاعر يناكب امرئ القيس، ومدرس ماهر شفيق، ومرب يحمل بين جوانحه قلبا خفاقا متألما متوجعا لاعادة الثقة الى الجيل بالاسلام واحكامه“ ۔(۷)	وہ صاحب قدرت ترجمہ نگار، علم عروض کے شہرت یافتہ عالم، عظیم داعی، اسلام کے پاسبان، ایسے شاعر جو اپنی شاعری میں (عرب کے مشہور شاعر) امرؤالقیس کے خوشہ چین تھے، ماہر و مشفق مدرس اور ایسے مربی تھے جس کا دل نسل انسانی کو اسلام اور اس کے احکام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہر آن کوشاں اور متفکر تھا۔

میرک شاہ ایک دیندار کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے، ۱۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے، والد ایک جید عالم دین تھے جن سے ابتدائی تربیت پا کر بنیادی تعلیم حاصل کی، خداداد بصیرت اور صلاحیت پائی تھی، جس کا ظہور وقت کے اہل دانش اور ارباب فن سے بہرہ ور ہونے کے بعد ہوا ان میں نابغہ روزگار عالم دین اور مشہور محدث وفقیہ علامہ انور شاہ کشمیری شامل ہیں، علامہ ان کی علمی لیاقت اور فہم وفراست سے بے حد متاثر تھے، چنانچہ انہی کے مشورہ سے دارالعلوم دیو بند میں

داخلہ لیا جہاں علوم متداولہ، فقہ، تفسیر، حدیث، لغت و تاریخ وغیرہ میں مہارت حاصل کی، اس کے بعد جامعہ پنجاب میں داخلہ لے کر امتیازی درجے کے ساتھ فضیلت کی سند حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت استاذ مقرر ہوئے، دارالعلوم کے علاوہ تبلیغ کالج کرنال میں بھی درس دیا، تقسیم ہند کے بعد جامعہ مدینہ لاہور میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے لاہور ہی میں ۱۹۷۵ء میں وفات پائی۔

میرک شاہ عربی و فارسی اور اردو زبان کے متبحر عالم تھے، ان کی کئی کتابیں ہیں جن میں مندرجہ ذیل اہم ہیں:

۱- **شرح موطا امام مالک** : یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

۲- **مختار التراجم** : کشمیری زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔

۳- **حیاۃ النبی ﷺ** : اردو زبان میں سیرت رسولؐ کے موضوع پر مصنف کا مایہ ناز علمی رسالہ ہے۔

۴- **شب** : مسدس کی صوت میں موصوف کی ایک فارسی نظم ہے۔

۵- **عقیدۃ الاتقیاء فی حیاۃ الانبیاء** : علم المعانی کے موضوع پر ایک مختصر کتابچہ ہے۔

۶- **ترجمہ "اکفار الملحدین"** : مذکورہ کتاب علامہ انور شاہ کشمیری کی تالیف "**اکفار الملحدین فی شئ من ضروریات الدین**" کا اردو ترجمہ ہے اور چار اجزاء پر مشتمل ہے۔

عربی زبان میں میرک شاہ کی یادگار فن عروض کی متداول کتاب "**محیط الدائرۃ**" کی عربی شرح ہے جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں قیام کے دوران مفتی محمد شفیع (مفتی اعظم پاکستان) کے ایما پر لکھی، "**محیط الدائرۃ فی علم العروض والقافیۃ**" فن عروض وقافیہ کے موضوع پر ایک عیسائی عالم "کرنیلیوس قان ذیک" کی مشہور تالیف ہے جو اس موضوع پر عمدہ کتاب شمار ہوتی ہے اور بعض مباحث میں بڑی گنجلک اور عسیر الفہم ہے، اسی لیے تشریح و توضیح کی محتاج تھی، میرک شاہ نے اس کے معانی و مطالب کو آسان طریقہ پر ذہن نشین کرنے

کے لیے اس کی شرح قلم بند کی اور اس طرح اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کر دیا۔

حواشی

(۱) پیچ نامہ: تصحیح و تعلیق، عمر بن محمد داؤد پوتہ، حیدرآباد ۱۹۳۹ء، ص ۹۔ (۲) نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، از عبدالحیٔ الحسنی، ج ۵، ص ۳۰۔ (۳) کشمیر میں شعر وادب کی تاریخ، از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، ص ۷۹۔ (۴) نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، ج ۷، ص ۲۶۱۔ (۵) تاریخ دار العلوم دیوبند، از سید محبوب رضوی، ج ۲، ص ۷۵۔ (۶) کشمیر میں شعر وادب کی تاریخ، ص ۲۵۔ (۷) اماثل کشمیر، از ڈاکٹر مظفر حسین ندوی، ص ۳۴۵۔

مراجع ومصادر (عربی)

(۱) نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، للسيد عبد الحئى الحسنى، ط/۱، مطبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية بحيدرآباد، عام ۱۹۵۵م۔

(۲) اماثل کشمیر للدکتور مظفر حسین الندوی، بیت الحکمة الندویة، شاہ ہمدان کالونی۔

(۳) مساهمة اهل کشمیر فی اللغة العربیة والادب العربی، للدکتور مظفر حسین الندوی، ج ۱، ۲، بیت الحکمة الندویة، شاہ ہمدان کالونی، کشمیر۔

(۴) نفحة العبر فی سیرة الشیخ انور، محمد یوسف البنوری، محمدی پریس دیوبند۔

(۵) شرح محیط الدائرة لمیرك شاہ کشمیری، محمدی پریس دیوبند، عام ۱۳۸۸ھ

(اردو)

(۱) کشمیر میں شعر وادب کی تاریخ، از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، نیو کشمیر پریس فوٹو لیتھو ورکس دہلی۔

(۲) کشمیر میں عربی علوم اور اسلامی ثقافت کی اشاعت، از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، نیو کشمیر پریس فوٹو لیتھو ورکس دہلی۔

(۳) علمائے ہند کا شاندار ماضی، از مولانا سید محمد میاں دیوبندی، طبع ثالث، جمعیت پریس دہلی۔

(۴) حیات انور، از مولانا ازہر شاہ، محمدی پریس دیوبند، ۱۹۷۷م۔

(۵) مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حیات اور علمی کارنامے، شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۴م۔

(۶) تاریخ دار العلوم دیوبند، ادارۂ اہتمام دار العلوم دیوبند، ۱۹۷۷م۔

(۷) اکابر علمائے دیوبند، از حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ادارۂ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۹م۔

اخبار علمیہ

''پاکستان میں فارسی مخطوطات کی جامع فہرست کی تیاری''

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں موجود مخطوطات کے تعارف پر مشتمل اب تک سینکڑوں فہرستیں شائع ہوچکی ہیں، اس کے باوجود ہزاروں مخطوطات کی فہرست سازی کا کام باقی ہے، پاکستان کے نجی کتب خانوں میں موجود فارسی مخطوطات کی فہرست سازی کا ایک منصوبہ ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب نے لندن میں قائم ھیئة المخطوطات الاسلامیة (Islamic Manuscript Association) کے مالی تعاون سے ۲۰۱۰ء میں شروع کیا تھا جو تاحال جاری ہے، اس کی کل چار جلدیں ہوں گی۔ علوم اسلامیہ، اخلاقیات اور تصوف پر مخطوطات کی فہرستوں کی دو جلدیں مرتب کی جاچکی ہیں۔ اگلی دو جلدوں میں علوم شرقیہ، علوم غربیہ، ادبیات اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ پر کام ہوگا۔ اس وقت اس منصوبہ کی تیسری جلد پر کام ہورہا ہے جو طب، کیمیا، رمل، جفر وغیرہ پر مشتمل ہے، ۲۰۱۵ء میں انشاءاللہ یہ منصوبہ مکمل ہوکر اشاعت پذیر ہوسکے گا۔ ان چار جلدوں میں تقریباً دس ہزار مخطوطات کا تعارف کرایا جائے گا۔ یہ اطلاع ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب نے معارف کو دی ہے۔

''سعودی عرب کے سر پر تاج اولیت''

شاہ عبدالعزیز سٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی جانب سے جاری ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سعودی عرب عالم اسلام کا پہلا ملک ہے جس نے گذشتہ ۳۶ برسوں کی شدید محنت کے بعد چار ڈرون یعنی بغیر پائیلٹ کے اڑنے والے طیارے اور مختلف صلاحیتوں کے حامل ۱۲ مصنوعی سیارے بناکر خلا میں چھوڑ دیے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق سعودی عرب کا اب تک کا بہترین ڈرون طیارہ آٹھ گھنٹہ فضا میں رہ کر ۱۲۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پانچ ہزار میٹر بلندی پر ۱۵۰ کلومیٹر دوری تک پرواز کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ۵-۶ گھنٹے فضا میں معلق رہنے والے صغیر الحجم ڈرون بھی حکومت نے بنائے ہیں جو ۱۲۰ کلومیٹر دوری تک ۱۲۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پانچ اور ایک ہزار میٹر بلندی پر اڑ سکتے ہیں۔ اس وقت ان کے کل چار ڈرون طیارے اور ۱۲ مصنوعی سیارے عرب ممالک، یورپ، افریقہ، ہندوستان اور پاکستان سے مواصلاتی روابط میں مدد کررہے ہیں۔ اس طرح سعودی عرب ڈرون طیاروں اور مصنوعی سیاروں کو بنانے میں دوسرے اسلامی ملکوں سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس خلائی ٹیکنالوجی میں سعودی عرب نے کسی بھی دوسرے ملک کی ٹیکنالوجی یا کسی بھی قسم کا سامان استعمال نہیں کیا ہے۔ (یہ خبر العربیہ ڈاٹ نٹ

۲۳/ستمبر ۱۳ء/۱۸/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ کی اشاعت پر موجود ہے)

''عراق میں مخطوطات کے لیے محافظ خانوں کا قیام''

عراق میں مخطوطات اور عمدہ کتابوں کی حفاظت کے لیے ایسے شفاخانے قائم کیے جائیں گے جہاں کتابیں اور روشنائی مریض ہوں گی اور اس کی دیکھ ریکھ کرنے والے ڈاکٹر اور نرس ہوں گے اور جہاں یہ مخطوطات رکھے جائیں گے وہ جگہ اسپتال۔ دائرة المخطوطات العراقية کے جنرل سکریٹری قیس حسین رشید نے بتایا کہ عراقی میوزیم کی عمارت میں اٹلی کے ماہرین مخطوطات کا اسپتال ہوگا جہاں ہمارے مخطوطات کی جدید ٹیکنیکل طریقے سے حفاظت کا نظم ہوگا، ادھر گذشتہ چند برسوں میں مختلف اسباب کی بنا پر عراق کے اس علمی ورثہ کا ایک تہائی حصہ تلف ہو چکا ہے اسی لیے اس کی جانب توجہ دینا ضروری ہے، انہوں نے مزید کہا کہ جس طرح کائنات کی دوسری مخلوقات متعدد قسم کی بیماریوں کی شکار ہوتی ہیں اور ان کی صحت کے لیے دواؤں اور دوسری قسم کے علاج معالجہ کی ضرورت پڑتی ہے بالکل اسی طرح مخطوطات کی جلدیں، صفحات اور روشنائیاں بھی بوسیدہ اور کمزور ہو جاتی ہیں بالخصوص جن جگہوں یا کمروں میں یہ مخطوطات رکھے جاتے ہیں موسم کی رطوبت اور اس کی خشکی انہیں متاثر کرتی ہے جس کے سبب جلدیں اور صفحات کمزور اور روشنائی مٹنے لگتی ہے، چنانچہ ان کی بقا کے لیے جدید ٹیکنیکل طریقوں کا استعمال ضروری ہے، اسی لیے ماہرین سے معاہدہ میں طے ہوا ہے کہ لوگوں کی اس سلسلہ میں تربیت کی جائے۔ الدراسات والبحوث فی ھیئۃ الآثار، عراق کے جنرل سکریٹری عبداللہ حامد محسن نے بتایا کہ ''ہمارے پاس دو لاکھ عناوین کے تحت ۴۵ ہزار سے زیادہ ایسے مخطوطات ہیں جن کا تعلق عراق کی اسلامی تہذیب و ثقافت سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت پوری انسانی تہذیبی ورثہ کی ہے، بعض مخطوطات دنیا کی صف اول کے مخطوطات کی فہرست میں رکھے جاسکتے ہیں، مثلاً حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصحف، ابن سینا کی القانون فی الطب، دیوان متنبّی، ہجرت کے ابتدائی سالوں کی بعض قرآنی آیتیں وغیرہ جو دنیا میں کہیں اور نہیں ہیں، اسی طرح چمڑے اور مختلف قسم کے دوسرے اوراق والے مخطوطات کی اتنی بڑی تعداد شاید ہی کہیں اور ہو۔ (تفصیلی خبر العربیہ ڈاٹ نٹ ۱۴/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ/۱۹/ستمبر ۱۳ء میں شائع ہوئی ہے، یہاں اس کے ضروری حصے کی تلخیص ہے)

''ممبر اسمبلی کے لیے تلاوت مع تجوید ضروری ہے''

انڈونیشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ہے۔ ۹۰ فیصد مسلمانوں کی جملہ تعداد ۲۴۰ ملین بتائی جاتی ہے، ۱۹۹۸ء میں صدر سوہارتو کے بعد اس ملک میں دین بالخصوص قرآن کی جانب التفات

کی شرح میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے اور ملکی سطح پر اسلامی جماعتوں کے قیام وفروغ پر بھی توجہ دی جارہی ہے۔اس کی ریاست ''آچھا'' کی مقامی حکومت نے ممبر اسمبلی کے انتخاب کی ایک شرط یہ رکھی ہے کہ انہیں قرآن مجید کی تلاوت مع تجوید کرنا ضروری ہے۔اس امتحان سے گذرے بغیر کوئی شخص اسمبلی کا رکن نہیں ہوسکتا۔(صراط مستقیم، برمنگھم، اگست ۱۳ء)

''پیغام رسانی کے لیے الوؤں کا استعمال''

ذرائع ابلاغ ومراسلت میں الوؤں کے استعمال کا طریقہ عہد قدیم میں رائج تھا مگر عہد حاضر میں پیغام رسانی ومراسلت کے لیے ان کا استعمال حیرت انگیز ہے، برطانیہ کے شمالی یارکشائر کے اوول سنٹر نے خطوط رسانی کے لیے اس قدیم طریقہ کو اپنایا ہے، اس کے ذمہ داروں کا کہنا ہے کہ الوؤں کو چھ بنیادی رنگوں کی تربیت دی جاتی ہے کہ کون سے رنگ کا خط کس جگہ پہنچانا ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ سنٹر نے یہ اقدامات اخراجات کی کمی کے پیش نظر کیے ہیں۔(منصف حیدرآباد، ص۴، ۱۲/جون ۱۳ء)

''سرکاری پالیسی کے تحت انکشاف''

سعودی انجینئرنگ کونسل کے اعداد وشمار کے مطابق اس وقت ملک میں ۶۰ ہزار غیر ملکی انجینئر مصروف عمل ہیں ۔اس کے ڈائریکٹر حمد الشقاوی کے بیان کے مطابق سرکاری پالیسی کے تحت جب ویزوں میں درج شدہ پیشوں کی تصحیح کے لیے تین ماہ کی مہلت کا اعلان کیا گیا تو بہت سے ملازمین نے پیشہ کی تبدیلی کی خواہش ظاہر کی، ان کے اس اجتماعی عمل پر کونسل کو شبہہ ہوا اور انہوں نے اسناد کی چھان بین کا فیصلہ کیا تو صرف دومہینوں کی چھان بین میں ۱۵/ ہزار غیر ملکی انجینئروں کی اسناد کے جعلی ہونے کا پتہ چلا۔جب اس صورت حال کی اطلاع کونسل نے وزارت داخلہ کو دی تو وزارت نے فوراً ان کی گرفتاری کے احکامات صادر کیے، متعدد گرفتاریاں بھی ہوئیں مگر بیشتر فرار ہوچکے ہیں، رپورٹ کے مطابق کونسل نے ڈگریوں کی تحقیقات کے لیے ایک سافٹ ویئر بھی بنالیا ہے اور دیگر پیشوں سے وابستہ اسناد کی تفتیش کا بھی ارادہ ہے، ادھر علماء کونسل نے جعلی اسناد کے ذریعہ کمائی کو حرام قرار دیا ہے، واضح رہے کہ سعودی عرب میں انجینیئرنگ کا شعبہ منافع بخش تصور کیا جاتا ہے اور وہاں انجینیئروں کو بھاری تنخواہیں اور مراعات ملتی ہیں۔ (العربیہ ڈاٹ نٹ)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

''معارف''

ادارۂ معارف نوشاہیہ،
۶۹ ماڈل ٹاؤن، ہمک،
اسلام آباد، پاکستان
۹ ستمبر ۲۰۱۳ء

مکرم ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب دام افاضہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ستمبر ۲۰۱۳ کے معارف کی پی ڈی ایف فائل آپ کی عنایت سے ملی۔ بہت ممنون ہوں کہ کاغذی نسخہ یہاں پہنچنے سے قبل ہی اس کا برقی رعکسی نسخہ مل گیا اور میں اس کے مندرجات سے مستفید ہو رہا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں اسلامی علوم وادبیات اور تحقیق وتدقیق کے حوالے سے معارف، برصغیر میں جو خدمت انجام دے رہا ہے وہ بالواسطہ اسلام ہی کی خدمت ہے۔ جو شخص بھی اسلام کی علمی نشأۃ ثانیہ کا درد رکھتا ہے اور برصغیر میں سلف صالحین کے نام کو ضایع کرنا نہیں چاہتا، اسے اگر معارف کی دامے، درمے نہیں تو قدمے، سخنے مدد ضرور کرنی چاہیے۔ یہاں بیٹھے معارف کی ''دامے درمے'' مدد نہ سہی، ''قلمے'' معاونت تو ہو سکتی ہے۔ میں اگر کوئی مقالہ لکھتا ہوں تو معارف میں چھپنے کا حق مقدم سمجھتا ہوں۔ اس کی سابق الذکر وجہ کے علاوہ، اور بہت سی وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ وقت مقررہ پر شایع ہوتا ہے، اس کی ضخامت طے شدہ ہے اور اس کی تقسیم کا نظام منظّم ہے۔ اب ہمارے ہاں اکثر وبیشتر نام کے ''تحقیقی'' جرائد یونیورسٹیوں کے شعبوں سے نکلتے ہیں، لیکن ان کا کوئی نظام الاوقات نہیں اور نام نہاد بین الاقوامی مجلس

مشاورت کے باوجود ان کا معیار معارف کے سابقہ ادوار کے کسی شمارے جیسا بھی نہیں ہے۔

معارف کے ادوار گذشتہ کا ذکر درمیان میں آیا تو جی چاہتا ہے آپ کو بتاؤں کہ میرا معارف سے تعلق تیس سالوں سے اوپر کا ہے۔ معارف میں میرا پہلا مقالہ ''دریافت تذکرۂ حدیقۂ ہندی'' فروری ۱۹۸۱ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ اس مقالے سے میری کئی یادیں وابستہ ہیں۔ یہ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور اولین مقالات میں سے تھا۔ میں سمجھتا ہوں اس کا معارف میں چھپنا اس کے موضوع کی اہمیت کی وجہ سے تھا، جو ایک گم شدہ ہندوستانی تذکرے کی ایران میں بازیافت کی خبر تھی۔ معارف چونکہ پاکستان کے علمی حلقوں میں پڑھا جاتا ہے، اس مقالے کی بازگشت یہاں بھی سنائی دی۔ میں دو واقعات آپ کو سناتا ہوں۔ میں چاہتا تھا یہ مقالہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور میں بھی چھپ جائے۔ مقالہ لے کر میں ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم (مدیر اورینٹل کالج میگزین) کے پاس گیا۔ انہوں نے مقالہ دیکھ کر کہا کہ اس کی Flash (یعنی چندھیا دینے والی روشنی) تو معارف نے چلا دی! ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ معارف نے یہ مقالہ چھاپ کر ہمارے لیے تذکرے کی دریافت کی خبر کی اشاعت کی پہل ختم کر دی ہے۔ انھی ایام میں، حدیقۂ ہندی کی عکسی نقل لے کر کراچی میں مشفق خواجہ مرحوم کے ہاں گیا تو ڈاکٹر جمیل جالبی بھی تشریف رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب نے مجھے ان سے متعارف کرواتے ہوئے جو حوالہ دیا وہ مجھے اب تک نہیں بھولا، کہا: ''اس نوجوان کے مضامین، معارف میں چھپتے ہیں!'' آپ تصور فرما سکتے ہیں کہ اس زمانے میں معارف میں کسی تازہ کار کیا، پختہ کار محقق کا مقالہ چھپنا بھی ایک اعزاز اور حوالے کی بات تھی۔

معارف، مجھ طالب علم کے لیے نمونے کا پرچہ تھا۔ میں نے اسے باقاعدگی سے حاصل کرنے کے لیے اپنے کرم فرما ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی (علی گڑھ)، خدا انہیں خوش رکھے، کو زحمت دی۔ وہ میرا سالانہ چندہ اعظم گڑھ جمع کروا دیتے اور میں خاطر جمع رکھ کر سال بھر پرچہ وصول کرتا رہتا۔ یہ سلسلہ چند سال تک جاری رہا۔ حتی کہ ان سالوں میں بھی جب میں ایران میں قیام پذیر تھا (۱۹۸۹ - ۱۹۹۵) لیکن پاکستان میں معارف منگواتا رہا اور جب بھی پاکستان آتا، جمع شدہ شمارے پڑھنا میرے لیے مفرح خاطر ہوتا۔ اس دوران گاہے بگاہے میرے مقالات بھی معارف

میں شایع ہوتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ معارف پر دینی موضوعات پر خشک مقالات کا غلبہ ہو گیا ہے اور ادبی مقالات کی اشاعت بالکل نہیں ہو رہی یا مقالات کا معیار بھی وہ نہیں رہا جو اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ میرے لیے معارف اب اپنی دلچسپی کھو چکا تھا۔ ان حالات میں میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ ڈاکٹر نعمانی میرے لیے یہ خدمت محض میری علمی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کرتے رہیں۔ میں نے ان سے کہہ کر اپنے لیے معارف کی ترسیل بند کروادی۔ (نعمانی صاحب اس خدمت پر عنداللہ ماجور ہوں گے۔)

تا آں کہ، آپ نے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کی قیادت اور معارف کی ترتیب و تدوین سنبھالی۔ اب آہستہ آہستہ معارف کا رنگ بدلنے لگا ہے اور میں بھی مستعد ہو گیا ہوں۔ میں انشاءاللہ معارف کے لیے، جسے احترام سے ''معارف شریف'' کہنے کو دل چاہتا ہے، اپنے شکستہ بستہ مقالات پیش کرتا رہوں گا۔

(جناب) عارف نوشاہی

''ایران میں اسناد کی خرید و فروخت''

گوشۂ مطالعات فارسی

پوسٹ بکس نمبر ۱۴۴، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

۲۰۱۳/۸/۹ء

گرامی مراتب زادت عنایاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جولائی ۲۰۱۳ء کے ''معارف'' میں صفحہ ۵۳ پر ''ایران میں اسناد کی خرید و فروخت'' کے عنوان سے ''وائس آف جرمنی'' کے حوالے سے ایک خبر چھپی ہے۔ اس کے متعلق ایران کے ایک صاحب نے فون پر مجھ سے کہا ہے کہ ''آپ تک یہ بات پہنچا دوں کہ اس طرح کی خبریں جو

اسلام کے دشمنوں اور مسلمانوں کے خون کے پیاسوں کی طرف سے پھیلائی جاتی ہیں صرف مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے وضع کی جاتی ہیں۔ کسی دشمن کی خبر کو اس طرح اعتماد کے ساتھ کم از کم ''معارف'' جیسے رسائل میں شائع نہیں کرنا چاہیے اس طرح کے کام تو ہندوستان کے بہت سے شہروں میں بھی ہوتے ہیں اور آئے دن بھارت کے اخباروں میں ان کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ انگریزوں کے یہاں بھی اس سے کہیں زیادہ گھناؤنے کام ہوتے رہتے ہیں وہ لوگ اپنی مکاریوں کو چھپانے کے لیے ایران، سعودیہ، عراق، مصر وغیرہ کے بارے میں ایسی جھوٹی خبریں پھیلاتے رہتے ہیں''۔

پرسوں ریاضی صاحب کا فون آیا تھا کہ انہوں نے اپنی نظم کے پہلے مصرعے میں ترمیم کرلی ہے۔

جویائے خیر
رئیس احمد نعمانی

دارالمصنّفین کا سلسلہ مکاتیب

۱- مکاتیب شبلی اول (جدید)	مرتبہ سید سلیمان ندویؒ	قیمت: ۱۵۰روپے
۲- مکاتیب شبلی دوم (جدید)	مرتبہ سید سلیمان ندویؒ	قیمت: ۱۸۰روپے
۳- برید فرنگ	مرتبہ سید سلیمان ندویؒ	قیمت: ۳۵روپے
۴- مشاہیر کے خطوط (بہ نام سید سلیمان ندوی)	ادارہ	قیمت: ۵۴روپے

وفیات

ڈاکٹر سید عبدالباری مرحوم

گذشتہ دنوں مولانا زین العابدین، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام بحری آبادی، پروفیسر لطف الرحمٰن اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے اصحاب فضل وکمال اس دنیا سے رخصت ہوکر علم وادب وتحقیق کی محفلوں کو سونا کر گئے، اداسی اس وقت اور بڑھ گئی جب خبر ملی کہ ڈاکٹر سید عبدالباری بھی اپنے رب حقیقی سے جا ملے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔

۷/ستمبر ۳۷ء کو پیدا ہوئے اور یکم ستمبر ۲۰۱۳ء کو وفات پائی یعنی قریب ۷۶ سال کی عمر پائی، مولد ٹانڈہ اکبر پور میں ابتدائی تعلیم کے بعد باقی تعلیمی مرحلے لکھنؤ، گورکھپور میں طے کیے، اردو کے علاوہ انگریزی میں ایم اے کیا، ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، کچھ وقت رامپور میں گزارا، سلطان پور کے ایک کالج اور پھر اودھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہوئے، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمود الٰہی جیسے اساتذہ اور م۔نسیم، ابوالمجاہد زاہد، ابن فرید، رشید کوثر فاروقی جیسے احباب کی رفاقت نے ان کو تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف میں امتیازی شان عطا کی، انفرادیت اور امتیاز اصلاً قسام ازل کی عطا ہے، خوش نصیب وہی ہیں جن کو روز اول سے فکر کی سلاست اور نظر کی اصابت مل جاتی ہے، جس کی وجہ سے ذوق کی راہ ہمیشہ مستقیم ہی رہتی ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ابتدائے عمر ہی سے اپنی راہ متعین کی، نوعمری میں دوام جیسے صالح اور بامقصد رسالہ کی اشاعت ان کی فکری، ادبی اور شعری صالحیت کی نوید تھی، جس کا ظہور دوام کے ساتھ نئی نسلیں، پیش رفت اور ملی اتحاد جیسے رسائل کے ذریعہ ہوا اور یہ ان کی بامقصد زندگی کی شناخت بن گیا، ان کی تحریروں کے مجموعے کم نہیں، کچھ نام تو مشہور ہیں جیسے لکھنؤ کا شعر وادب (۱۸۵۷ تک) لکھنؤ کے ادب کا ثقافتی ومعاشرتی مطالعہ (۴۷ تک) ہندوستانی تہذیب اور اردو، آزادی کے بعد اردو شعر وادب، ادب اور وابستگی، نقد نو عیار، افکار تازہ، کاوش نظر، آداب

شناخت، تراوش خیال، بیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ، نئی خوشبو نئے خواب، اسمائے حسنٰی اور کردار سازی، ملاقاتیں وغیرہ وغیرہ، ایک سفرنامۂ حج 'جلوے ہیں بے شمار' کے نام سے اور دو شعری مجموعے فکر انگیز اور طرب خیز کے عنوان سے ہیں، شعری اظہار کے لیے تخلص شبنم سبحانی اختیار کیا، لطافت اور پاکیزگی کا یہ شعور محض اتفاقی نہیں، نثر ہو یا شعر، جگر لالہ کی ٹھنڈک اور جذبوں کا تقدس ہمیشہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہا، ان کے وسیع اور طویل تحریری سلسلے میں فکر کی استقامت یکساں رہی بلکہ وقت کے ساتھ عقیدہ و یقین میں اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ وہ جس دور کی پیداوار تھے اس میں سیاست سے زیادہ فکری نظریات نے ہندوستان اور خاص طور پر اردو دنیا کو مضطرب ہی نہیں کہنا چاہیے تہس نہس کر رکھا تھا، ادبی نظریات کی اس اتھل پتھل میں ڈاکٹر صاحب نے جس طرح قلم کی امانت اور اس کی حرمت کی پاسبانی کی وہ یقیناً بڑا کارنامہ ہے، شبلی، حالی، سلیمان و اقبال، مودودی اور مولانا علی میاں سے متاثر ہوکر انہوں نے جدید مغربی تہذیب و ثقافت کے اصل مرض یعنی خدا بیزاری کو عام وبا کی شکل میں دیکھا، اس کا ازالہ ان کی نظر میں صرف اسلام کے تہذیبی و فکری و ادبی عناصر کے اظہار سے ممکن تھا، ان کی تمام تحریریں بس اسی اجمال کی تفصیل ہیں، مشرق و مغرب کی تہذیبی آویزش اور اس کے نتائج کے طور پر ترقی پسند تحریک ہو یا جدیدیت یا مابعد جدیدیت جیسے نظریات کا ظہور اور ان کی اشاعت کی کوشش ہو، ڈاکٹر صاحب نے بڑی غیر جانب داری سے حسن و قبح کی میزان اپنے ہاتھوں میں لی اور اس خیال یا دعوی کو بڑے سلیقے سے رد کیا کہ ترقی پسند تحریک نے پہلی بار ملک کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں پرونے کی کوشش کی انہوں نے ثابت کیا کہ نظریہ پسندی اور مقصدیت کے نام پر ادعائیت، فکری انارکی اور تضادات سے یہ تحریک پہچانی گئی وجہ یہی تھی کہ اس کے پاس کوئی مربوط فکر یا نظریہ تھا ہی نہیں، نظریہ کے جوش میں فن نظر انداز ہوا وہ الگ، اور جذبہ و احساس کا تو خانہ ہی خالی چھوڑ دیا گیا، جدیدیت کا نظریہ ماقبل کے رد کی شکل میں سامنے آیا لیکن ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ ''مستقبل سے مایوس نسل انسانی کی برہمی اور مایوسی میں اضافہ کے سوا اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکا'' اشتہاری اور گروپ ساز علم و دانش کے دعویدار یقیناً حریف پنجہ فگن تھے، ان سے نبرد آزمائی آسان نہیں تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ فریضہ ہمت و اعتماد سے ادا کیا

وجہ صاف اور ظاہر ہے کہ فکر وفن کی ماحولیاتی آلودگی کے وہ بیمار ہوئے نہ شکار۔ عقیدہ ان کا خالص اور شفاف رہا، وہ جانتے تھے کہ پرواز کے لیے پر تو سبھی تولتے ہیں لیکن مجال پرواز اسی کو ہے جسے آسمانوں کے خالق کی اجازت حاصل ہو، انہوں نے ایک نعت میں فریاد کی کہ ملت نے متاع وحدت اور سرمایہ گداز خلوص کھودیا ہے اور یہ کہ شعور وفکر پہ پہرے ہیں کم نگاہوں کے، اس لیے ع

طلب یہ ہے کہ چراغ رہ حیات ہوں ہم

وہ یقیناً راہ حیات کے چراغ تھے، ان کی روشنی سے دارالمصنّفین اور معارف بھی منور ہوتا رہا، یہاں کے سمیناروں میں وہ پابندی سے شریک ہوتے، ان کے مضامین، مراسلے معارف کی زینت بنتے رہے، چند ماہ قبل اور کیا معلوم تھا کہ آخری بار وہ ایک مذاکرہ علمی میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور مہمان خانہ کی سیڑھیوں پر پھسلنے کی وجہ سے ان کو کچھ چوٹ پہنچی لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا، مسکراتے ہی رہے، یہ دلنواز مسکراہٹ ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، شرافت اور اخلاق کریمانہ کا وہ ایسا پیکر تھے جس کی چمک میں کبھی فرق نہیں آیا، نرم دم گفتگو کی معنویت ان سے کھلتی تھی، شبلی کے وہ عقیدت مند تھے، نذر شبلی کے عنوان سے ایک طویل نظم میں انہوں نے کہا ؎

وہ پرواز تخیل وہ نگاہ نکتہ رس اس کی ... نہ جانے فاش تھے فطرت کے کتنے راز شبلی پر

اسی رشتہ عقیدت نے ہم کو بھی ان کے لطف وکرم کا مستحق بنا رکھا تھا، ان کے جانے کے بعد بھی ان کی یہ آواز ہماری دنیا میں گونجتی رہے گی کہ

میرے سینے مرے لب پہ اک آگ ہے/ رات کی جس سے زنجیر گل جائے گی/ آئے گی صبح تابندہ پھر آئے گی

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

ع-ص

باب التقریظ والانتقاد

''کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ''
مولفہ ڈاکٹر عارف نوشاہی

ڈاکٹر عطا خورشید

ڈاکٹر عارف نوشاہی کا نام برصغیر میں فارسی ادب کے صف اول کے محققین میں ہوتا ہے۔ انہوں ایک بہترین ادیب، فہرست ساز اور کتابیات ساز ہیں۔ فارسی ادب سے متعلق اب تک ان کے سو سے زائد تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں مخطوطہ شناسی کے فن میں اختصاص حاصل ہے۔ دور جدید کے مشہور و معروف فارسی مخطوطہ شناس احمد منزوی (ایران) کے ساتھ انھوں نے مخطوطات کی فہرست سازی کا کام کیا ہے جو ۱۴ جلدوں میں ''فہرست مشترک نسخہ ھای خطی فارسی پاکستان'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ (اس پراجیکٹ کی آخری یعنی مکمل چودہویں جلد بالخصوص عارف نوشاہی کی مرتبہ ہے۔) پاکستان کے مختلف کتاب خانوں کے مخطوطات کی فہرستیں بھی انہوں نے تیار کر کے شائع کرائی ہیں۔ سب سے پہلی فہرست نیشنل میوزیم، کراچی کے فارسی مخطوطات کی ''فہرست نسخہ ھای خطی فارسی موزۂ ملی پاکستان، کراچی'' کے عنوان سے ۱۹۸۳ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد دیگر کتاب خانوں کے مخطوطات کی فہرست سازی کا بھی سلسلہ انھوں نے چھیڑ دیا اور پاکستان کے کئی کتابخانوں کے مخطوطات کی فہرست تیار کی۔ جس میں کتاب خانہ گنج بخش (اسلام آباد) کے اردو مخطوطات (مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۸ء)؛ ڈاکٹر وحید قریشی کے ذاتی کتب خانہ (لاہور) کے فارسی، پنجابی مخطوطات کی فہرست (مطبوعہ لاہور، ۱۹۹۳ء)؛ نیشنل آرکائیوز آف پاکستان ذخیرۂ مفتی فضل عظیم (اسلام آباد) اور پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے فارسی مخطوطات کی فہرستیں (دونوں مطبوعہ تہران ۲۰۱۲ء) قابل ذکر ہیں۔ مخطوطات کی فہرست سازی کے علاوہ انہوں نے فارسی مطبوعات کی

فہرستیں بھی ترتیب دی ہیں۔ جن میں کتاب خانۂ گنج بخش (اسلام آباد) میں موجود قدیم فارسی مطبوعات کی فہرست اہم ہے جو دو جلدوں میں ''فہرست کتابہای فارسی چاپ سنگی و کمیاب کتابخانۂ گنج بخش'' کے عنوان سے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد سے ۸۹-۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ پاکستان اور ہندوستان کے کچھ ذاتی کتب خانوں کے مخطوطات کے حوالے سے ان کی کتاب سیہ بر سفید (مطبوعہ تہران، ۲۰۱۱ء) بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ سال گذشتہ ۲۰۱۲ء میں ان کی مرتبہ برصغیر (ہندوستان، پاکستان اور بنگلا دیش) میں طبع شدہ فارسی مطبوعات کی ایک فہرست منظر عام پر آئی ہے جس کا عنوان ہے ''کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ (ہند، پاکستان، بنگلا دیش) از ۱۱۶۰-۱۳۸۶ھ ش/ ۱۱۹۵-۱۴۲۸ھ/ ۱۷۸۱-۲۰۰۷م'' (حوالے کے لیے آگے صرف ''کتابشناسی'')۔ فارسی مطبوعات کی یہ کتابیات چار ضخیم جلدوں (کل صفحات ۳۰۱۵ بشمول اشاریۂ کتب و رجال صفحہ نمبر ۲۵۶۱ تا ۳۰۱۵) پر مشتمل ہے، جسے تہران (ایران) کے مشہور ناشر میراث مکتوب نے شائع کیا ہے۔

اس کتابیات کے ذریعہ برصغیر میں مطبوعہ فارسی ادب کے کوائف منظر عام پر آگئے ہیں۔ مرتب موصوف نے جس خوبصورتی، خوش اسلوبی، سلیقے اور سائنٹفک انداز سے یہ کتابیات تیار کی ہے، اس کے لیے وہ واقعی لائق مثال اور قابل مبارکباد ہیں۔ عام طور پر کسی اچھے اور معیاری کاموں کے لیے انگریزی یا یورپین کاموں کی مثال دی جاتی ہے، لیکن ڈاکٹر عارف نوشاہی کا محولہ بالا کام کسی بھی یورپین زبان میں کیے کام کے مقابلے میں بلا تکلف رکھا جا سکتا ہے۔

پیش نظر کتابیات موضوعاتی ترتیب کے تحت ترتیب دی گئی ہے جو سائنٹفک ترتیب ہے۔ تمام مطبوعات کو ۱۶ موضوعات پر تقسیم کیا گیا ہے نیز ان کی ۱۲۴ ر ذیلی تقسیم بھی کی گئی ہے۔ ہر موضوع کے تحت الفبائی ترتیب سے کتابوں کی تفصیلات لکھی گئی ہیں۔ ہر کتاب کی تفصیل کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں عنوانِ کتاب، نامِ مولف/ مترجم/ مرتب/ شارح/ مصحح، تاریخ وفاتِ مؤلف، سنہ تألیف، موضوع کی تشریح (اگر منظوم کتاب ہے تو پہلا بیت)۔ دوسرے حصے میں تاریخ اشاعت (ہجری و عیسوی)، طباعت کی نوعیت (سنگی، لیتھو یا عکسی)، مقام اشاعت، نام مطبع / ناشر، صفحات، منبع۔ اگر مختلف اشاعتیں ہیں تو تاریخ وار سبھی اشاعت کی تفصیل محولہ بالا

ترتیب کے ساتھ درج کی گئی ہیں ۔ جو اشاعت بدون تاریخ ہے اسے آخر میں رکھا گیا ہے۔ موضوعات کی تقسیم لائبریری سائنس کے ڈیوی ڈسمل تقسیم کے تحت کی گئی ہے لیکن اس میں مشرقی موضوعات کی تقسیم نہ ہونے کا بھی شکوہ کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں وہ سید محمود حسن قیصر امروہوی کے Islamic Sciences: Expansion of Dewy Decimal) Expansion Classification, Ed. XVI, for Oriental Libraries) کی مدد لیتے تو انھیں مشرقی موضوعات کی تقسیم میں دشواری کا شکوہ نہ ہوتا۔

''کتابشناسی'' کی ترتیب میں مرتب موصوف نے ۲۷ سال صَرف کیے۔ظاہر ہے جس کتابیات کو مکمل کرنے میں ۲۷ سال کا طویل عرصہ صَرف ہوا ہو اس کے اعلی معیار کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔اس کتابیات میں ۳۰۹ فارسی ، اردو و انگریزی منابع (فہارس کتب) کی مدد سے ۱۰۵۸۹/عنوانات کے تحت ان کی ۲۰۶۲۸/اشاعتیں درج کی گئی ہیں۔ ہر کتاب کی حتی الامکان معلوم اشاعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔بعض کتابوں کی تعداد اشاعت (Editions) دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔مثلاً ''اخلاق محسنی'' کی ۶۴/اشاعتوں کا ذکر ہے۔ میر سید شریف جرجانی کی ''نحو میر'' کی ۴۹/اشاعتوں کا ذکر ہے ۔''مواہب علیہ المعروف بہ تفسیر حسینی'' کی ۴۰/اشاعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔''بہار دانش'' مؤلفہ عنایت اللہ کنبولاہوری کی ۵۹/اشاعت،''انوار سہیلی'' مولفہ حسین واعظ کاشفی کی ۶۳/اشاعت ،''رقعات عالمگیری'' کی ۶۲/اشاعت،''دستورالصبیان'' مؤلفہ نوندھ رائے کی ۷۳/اشاعت،''انشای خلیفہ'' کی ۷۲/اشاعت،''گلستان'' مؤلفہ شیخ سعدی شیرازی کی ۳۰۸/اشاعت،''بوستان'' مؤلفہ شیخ سعدی شیرازی کی ۱۹۲/اشاعت،''میزان الطب'' مؤلفہ حکیم اکبرارزانی کی ۵۲/اشاعت،''صفوۃ المصادر'' مؤلفہ محمد مصطفیٰ خاں بن حاجی محمد روشن خاں کی ۸۸/ اشاعت ،''غیاث اللغات'' مؤلفہ غیاث الدین رامپوری کی ۶۱/اشاعت ،''کریما'' مؤلفہ شیخ سعدی شیرازی کی ۲۰۳/اشاعت ، ان اشاعتوں سے ان کتابوں کی ضرورت اور مقبولیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''کتابشناسی'' کے ذریعہ برصغیر کے فارسی ادب کی تاریخ ایک نظر میں سامنے آجاتی ہے۔اس کے ذریعہ یہ اطلاع ملتی ہے کہ برصغیر میں فارسی طباعت واشاعت کا آغاز اٹھارہویں

صدی میں ہوگیا تھا۔ چنانچہ فارسی کی پہلی مطبوعہ کتاب ''انشای ہرکرن'' ہے جو ۱۷۸۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ فارسی طباعت کا آغاز اُس وقت ہوا جب فارسی پر اردو زبان حاوی ہورہی تھی۔ فارسی کا چلن کم ہوتا جارہا تھا۔ اس کے باوجود اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں علمی وادبی زبان فارسی ہی تھی۔ ''انشای ہرکرن'' کی اشاعت (۱۷۸۱ء) سے لے کر ۲۰۰۷ء تک، پیش نظر کتابیات کی روشنی میں، دس ہزار سے زائد فارسی کتابیں اس برصغیر میں شائع ہوئیں۔

''کتابشناسی'' میں فارسی زبان میں شائع ہونے والی کتابوں کے علاوہ فارسی سے متعلق دیگر زبانوں بالخصوص اردو وانگریزی زبان میں شائع ہونے والی ایسی کتابوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن میں فارسی متن یا ان کے اقتباسات بھی شامل ہیں، یا اردو شعرا کے ان اردو دواوین کو شامل کیا گیا ہے جن میں فارسی کلام بھی شامل ہے۔

یہ کام ایک ٹیم ورک تھا جسے فرد واحد (ڈاکٹر عارف نوشاہی) نے انجام دیا۔ تنہا کام کرنے کے سبب اس میں کچھ خامیاں اور کمیاں دَر آئی ہیں جن کی نشاندہی کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اگلی اشاعت میں انھیں دور کیا جاسکے نیز جن کتابوں کا اندراج اس میں نہیں ہوسکا ہے ان کے لیے مرتب موصوف ایک تکملہ تیار کریں۔ میرا مشورہ ہے کہ مرتب موصوف اس تکملہ کی تکمیل کے لیے ہندوستان کی درج ذیل مشرقی لائبریریوں کا بذات خود دَورہ کریں: مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ؛ خدابخش لائبریری، پٹنہ؛ رضا لائبریری، رامپور؛ عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک (راجستھان)؛ کتابخانۂ ندوۃ العلما، لکھنو؛ شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ؛ کتابخانۂ مدرسہ مظاہر العلوم، سہارنپور وغیرہ۔ اس طرح کے علمی کاموں میں دوسروں پر اعتماد اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب اطلاع فراہم کرنے والا اس طرح کا علمی ذوق رکھتا ہو یا کام کرنے والے سے اسے ہمدردی ہو، ورنہ اس کی دی ہوئی اطلاع کبھی غلط بھی ہوسکتی ہے یا ان میں کمیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ مثلاً میرزا مظہر جانجاناں کی تالیف ''خریطۂ جواہر'' کے دارالمصنّفین اشاعت کی عدم شمولیت کے بارے میں جب میں نے پوچھا تو انھوں نے مجھے اپنے ایک برقی خط (مورخہ ۴/ نومبر ۲۰۱۲ء) میں اس کی عدم شمولیت کی نہایت دلچسپ وجہ بتائی۔ وہ وجہ انھیں کی زبانی نقل کرتا ہوں: ''میں نے اپنی کتابشناسی میں خریطہ جواہر کے دارالمصنّفین ایڈیشن کا اندراج بالواسطہ حوالے سے کیا تھا خود نہیں دیکھا تھا۔

جب اس کا اشاریہ بنانے لگا تو یہ اندراج پھر سامنے آیا، سوچا دارالمصنّفین خط لکھ کر کوایف کی تکمیل کرلوں۔ ایک ایمیل بھیجا اور کوایف کی تکمیل چاہی۔ وہاں سے جواب آیا کہ دارالمصنّفین نے کبھی خریطہ جواہر نہیں چھاپا۔ ناچار اپنی کتابشناسی سے وہ نامکمل کوایف بھی حذف کرنا پڑے۔ اب آپ کا بھیجا مقالہ [دارالمصنّفین سے بیاض مظہر جانجاناں 'خریطہ جواہر' کا شائع شدہ ایڈیشن مؤلفہ نواب رحمت اللہ خاں شروانی و ڈاکٹر عابد رضا بیدار، مطبوعہ ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، دسمبر ۲۰۰۵ء] دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ ایڈیشن بالفعل موجود ہے''۔

کتابشناسی میں اگرچہ سبھی عنوانات کی حتی الامکان اشاعتوں کا ذکر کیا گیا ہے پھر بھی اشاعتوں کی ایک بڑی تعداد شمولیت سے رہ گئی ہے۔ مثال کے لیے ایک حوالہ ہی کافی ہوگا کہ مرتب موصوف کے ایک مقالے بعنوان ''غرائب اللغات پر خان آرزو کے حواشی'' (مطبوعہ ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، مئی ۲۰۱۳ء) کے لیے ہم نے ''رسالہ عبدالواسع ہانسوی'' کی اُن ۹/اشاعتوں کی تفصیل انھیں بھیجی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں۔ اپنے برقی جواب (مورخہ ۲۹/اپریل ۲۰۱۳ء) میں اُنھوں نے مجھے لکھا: ''آپ نے رسالہ عبدالواسع کے جو عکس مجھے بھیجے ہیں ان کے کوایف میں نے اپنی فہرست شبہ قارہ [= کتابشناسی] سے ملائے تو مجھے مزید ۸ نئی اشاعتیں مل گئیں جن کا ذکر میری کتاب میں نہیں تھا۔'' اگرچہ مولانا آزاد لائبریری کا نام ان کے منابع میں شامل ہے، لیکن چونکہ یہ کام دور بیٹھ کر اور کسی دوسرے کی مدد سے کیا گیا اس لیے ایک بڑی تعداد اس میں شامل ہونے سے رہ گئی۔ مثال کے لیے میں حرف الف سے شروع ہونے والی صرف چند کتابوں کا ذکر یہاں کرتا ہوں جو مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں لیکن کتابشناسی میں ان کا اندراج نہیں ہے۔

۱) ابواب جامع صغیر، ترجمہ فارسی ......، مؤلفہ محمد بن الحسن شیبانی، مترجم نامعلوم، [آگرہ] مطبع مفید عام، ۱۳۰۵ھ، ۳۲ص

۲) ابواب قدوری، ترجمۂ فارسی، مولفہ ابوالحسین احمد قدوری بغدادی، مترجم نامعلوم، آگرہ، مطبع مفید عام، رجب ۱۳۰۵ھ، ۴۸ص

۳) اتخاذ الخطوط من ایجاد الخطوط مؤلفہ سید محمد حسن الحسینی ابن مولانا السید گلشن علی، ۱۲۹۰ھ/

۱۸۷۳ء، بنارس: مطبع سرکار مہاراجہ بنارس، ۶۶ق/۱۳۲ص

۴) اثبات وقف لازم مؤلفہ محمد علی جلال آبادی، کانپور: مطبع رزاقی، ۱۳۱۷ھ، ۴۰ص

۵) احسن التعلیم مؤلفہ فتح محمد تائب، [لکھنو] مطبع انوار محمدی، بی تا، ۲۸ص

۶) احسن الکلام معروف بہ ہفت بند نعت مؤلفہ عبدالقادر ناظم، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۳۱۷ھ، ۸ص

۷) احقاق الشفاعۃ مؤلفہ مولوی غلام نبی اللہ احمد، ۱۳۱۹ھ، مدراس: مطبع ہدایت، ۱۶ص

۸) انتخاب الحکم مؤلفہ عبدالرؤف، [؟] مطبع مفیدالانام، بی تا، ۴۲ص

۹) انسانگرای واخوت جہانی درشعر وادب فارسی (دردوجلد) مقالات سمینار بین المللی، بکوشش آزرمیدخت صفوی، علیگر: انستیتوی تحقیقات فارسی، دانشگاہ اسلامی علیگر، ۲۰۰۷م، جلد اول ۳۸۴ص؛ جلد دوم ۲۱۳+99 ص؛ عنوان انگلیسی: Humanism and Universal Brotherhood in Persian Literature.

۱۰) ایقاد المصابیح فی مسائل التراویح مؤلفہ محمد عبدالحلیم الانصاری اللکھنوی، [؟] مطبع سنگین، ۱۲۶۱ھ، ۷اص

۱۱) اینگلو پرشین گرامر مؤلفہ سید عبداللطیف، بمبئی: ایجوکیشن سوسائٹی پریس، ۱۸۸۷ء، ۱۰۴ص؛ عنوان انگلیسی: The Universal Anglo-Persian Grammer with vocublaries in English, Persian and Guzerati.

اگر تلاش کی جائیں تو صدہا کتابیں اس لائبریری میں ایسی مل جائیں گی جن کا اندراج کتابشناسی میں نہیں ہے۔ اور یہ صرف علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی دیگر مشرقی کتابخانوں میں مرتب موصوف کو ایسی صدہا کتابیں مل جائیں گی۔

''کتابشناسی'' کی دوسری اشاعت میں اصلاح کے لیے مشورۂ کتاب کے اندراجات کی چند خامیوں اور کمیوں کی طرف میں مرتب موصوف کی نگاہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:۔

(۱) یہ کتاب برصغیر ہندو پاک کے فارسی ادب پر ہے لہذا اس کا املا بھی ہندوستانی ہونا چاہیے نہ کہ ایرانی۔ جدید ایرانی فارسی میں یائے مجہول (ے) اور نون غنّہ (نون غیر منقوطہ) کا استعمال نہیں ہے۔ لیکن قدیم ہندوستانی فارسی میں اس کا استعمال رائج تھا۔ اردو زبان میں یہ دونوں حروف مروج

ہیں۔ ''کتابشناسی'' میں اردو عنوانات لکھنے میں بھی جدید فارسی املے کا استعمال کیا گیا ہے یعنی یائے مجہول کی جگہ یائے معروف (ی) اور نون غنہ کی جگہ نون منقوطہ، جس کے سبب کہیں کہیں الفاظ کی مضحکہ خیز صورت پیدا ہوگئی ہے جس کے پڑھنے اور سننے میں کانوں کو گراں گذرتا ہے۔ مثلاً ''امیر خسرو کے غیر مطبوعہ مقطعات'' کی جگہ ''امیر خسرو کی غیر مطبوعہ مقطعات'' (۷۶۰۷)؛ ''امیر خسرو کے چیدہ چیدہ کلام کا منظوم ترجمہ'' کی جگہ ''امیر خسرو کی چیدہ چیدہ کلام کا منظوم ترجمہ'' (۷۶۰۸)؛ ''باغ دودر میں شامل غالب کے فارسی خطوط'' کی جگہ ''باغ دودر مین شامل غالب کی فارسی خطوط'' (۹۹۶۵)؛ ''برصغیر میں موسیقی کے فارسی مآخذ'' کی جگہ ''برصغیر مین موسیقی کی فارسی مآخذ'' (۵۲۲۹)؛ ''ترقیمے، مہریں، عرض دیدے'' کی بجائے ''ترقیمی، مہر ین، عرض دیدی'' (۱۳۵)؛ ''ریاست میسور کے فارسی، عربی اور اردو کتبے'' کی بجائے ریاست میسور کی فارسی، عربی اور اردو کتبی (۹۶۸۱)۔ ایسی صدہا مثالیں اس میں موجود ہیں۔ امید ہے اگلی اشاعت میں ان کی اصلاح شدہ اور اصل شکل شائع ہوگی۔

(۲) بعض عنوانات بھی غلط لکھ گئے ہیں مثلاً کتابشناسی میں 'اکرم الناس' [اندراج ۱۰۴۰۸] اصل میں اکرام الناس۔ کتابشناسی میں 'اسرار حسن' [اندراج ۷۶۰۴] جبکہ اصل میں 'اسرار احسن' لکھا ہے۔ (مصنف احسن بلگرامی نے اپنے نام کی مناسبت سے عنوان قائم کیا ہے۔)

(۳) بعض اندراجات میں ادھورا عنوان لکھا گیا ہے مثلاً 'انشای فیض رحمانی' کو 'فیض رحمانی'؛ 'انشای بہار رقم' کو 'بہار رقم'؛ 'انشای بہار ہند' کو 'بہار ہند' وغیرہ۔ گرچہ لفظ 'انشای' کی شمولیت کے ساتھ تقریباً سو اندراجات اس میں موجود ہیں، لیکن نہ معلوم کیوں بعض عنوانات میں سے لفظ 'انشای' کو حذف کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اندراجات الفبائی ترتیب سے ہیں اس لیے عنوان میں موجود ہر حرف اور ہر لفظ کی اپنی جگہ افادیت ہے۔ ایک حرف یا لفظ کی کمی کے سبب اندراج کہیں کا کہیں پہنچ جائے گا اور قاری اسے اپنی اصل جگہ پر اصل عنوان کے تحت تلاش کرتا رہے گا جس کے حصول میں وہ ناکام رہے گا۔

(۴) بعض جگہوں پر ایک ہی مصنف کا اندراج دو علیحدہ ناموں سے کیا گیا ہے مثلاً سید شاہ عطا حسین المشتہر بعبد الرزاق کو ایک جگہ ''عطا حسین معروف بہ عبدالرزاق خاں'' (۹۷۵۷) لکھا ہے اور دوسری جگہ ''سید شاہ عطا حسین المبشر عبدالرزاق متخلص بہ خانی'' (۲۸۸۹) لکھا ہے۔

انڈکس میں بھی ثانی الذکر کا اندراج ''خانی'' کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ جبکہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں اور 'خان' نہ تو ان کے نام کا حصہ ہے اور نہ ہی 'خانی' ان کا تخلص، ان کا تخلص 'فانی' ہے۔ اسی طرح ''عبدالقادر ناظم، محمد'' (۱۴۴۵) اور ''ناظم، محمد عبدالقادر'' (۳۸۶۴، ۹۹۰۲ اور ۱۰۰۳۰) ایک ہی شخصیت ہیں جن کا اندراج دو علیحدہ ناموں سے کر دیا گیا ہے۔

(۵) بعض ہندی الفاظ کو سمجھنے میں اور نقل کرنے میں دشواری ہوئی ہے مثلاً ''انبرت کھند'' (۴۹۳)۔ اصل لفظ امرت کُنڈ یا انبرت کُنڈ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ حوض الحیات کا ترجمہ ہے اور حوض کو سنسکرت میں 'کُنڈ' کہا جاتا ہے۔ ''پنج آدھیای'' (۴۹۹)۔ 'آدھیای' نہیں بلکہ 'ادھیای' یعنی باب۔ ''جی سری درگا مہا پچھی'' (۵۱۸)۔ اصل عنوان ''جے سری درگا مہا پچھی'' ہوگا۔

(۶) ہر اندراج کے بعد اس کے منابع کا بھی ذکر کیا گیا ہے لیکن زیادہ تر ایک ہی منبع کا ذکر ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جتنے بھی منابع میں اس کتاب کا ذکر ہو اُن سبھی کا حوالہ دیا جائے۔ کتابشناسی میں زیادہ تر اولیت پاکستانی منابع کو دی گئی ہے۔ چونکہ یہ فہرست ہند و پاک کی مطبوعات کی ہے لہٰذا اس سے استفادہ کرنے والے دونوں ملکوں کے لوگ ہوں گے۔ اگر کسی کتاب کی موجودگی پاکستان کے کتابخانوں میں دکھائی گئی ہے تو ہندوستانی قارئین کے لیے اس کا استفادہ کرنا سہل نہیں ہوگا۔ اسی طرح ہندوستان میں موجود کتابوں سے مستفید ہونا پاکستانی اسکالرز کے لیے آسان نہیں ہے۔ اسی لیے اگر ہر دو ملکوں میں کسی کتاب کا نسخہ موجود ہو تو دونوں کی موجودگی کا پتا دیا جائے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو مطبوعات کی ایک کتابیات بعنوان ''قاموس الکتب'' کی داغ بیل ڈالی تھی جو مکمل نہیں ہو سکی۔ اس کی صرف تین جلدیں شائع ہو سکیں: پہلی جلد مذہبیات، دوسری تاریخیات اور تیسری جلد عمرانیات پر شائع ہوئی، آگے کا کام شائع نہ ہو سکا۔ اگرچہ بابائے اردو کے پاس ایک ادارہ تھا، ایک انجمن تھی، کام کرنے والا پورا عملہ تھا، پھر بھی یہ کام ادھورا رہ گیا۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر عارف نوشاہی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ تن تنہا انھوں نے اس طرح کے کام کو انجام دیا جبکہ ان کے پاس انجمن کی طرح نہ تو کوئی ادارہ ہے اور نہ ہی اس کی طرح کا کوئی عملہ یا کارکنان، پھر بھی انھوں نے اس کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ مبارکباد ڈاکٹر عارف نوشاہی!

ادبیات

تضمین بر نعت
حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ

ڈاکٹر التفات امجدی

رہے ہاتھوں میں دامانِ محمدؐ بسا ہو دل میں فرمانِ محمدؐ
نہ بھولوں گا کبھی شانِ محمدؐ ''منم ادنا ثنا خوانِ محمدؐ،،
''غلامِ از غلامانِ محمدؐ،،

محمدؐ حسن بوستانِ خداوند ہویدا ان سے ہی شانِ خداوند
وہ لے کے آئے فرمانِ خداوند ''محمدؐ ہست مہمانِ خداوند،،
''دوعالم ہست مہمانِ محمدؐ،،

ثنا خواں اُن کا ہے اک اک بشر، جن اُنہیں کا صدقہ تو ہیں رات اور دن
صفات اُن کے کہاں گننا ہے ممکن ''گنہگارم سیہ کارم و لیکن،،
''بدستم ہست دامانِ محمدؐ،،

یہ کہتے ہیں سبھی عاقل خردمند نبیؐ کی مدح سے ہو رُوح خُرسند
نہیں ہے اہلِ دل پر در کبھی بند محمدؐ حامد و حمد خداوند
''خداے ما ثنا خوانِ محمدؐ،،

جو سُن کر مہ جبینان و پری وش مری تضمین پر کرتے ہیں عش عش
مرادِ التفاتؔ است التفاتش ''نہ تنہا ہست جامیؔ نعت خوانش،،
''خداے ما ثنا خوانِ محمدؐ،،

خانقاہ امجدی، اسٹیشن روڈ، سیوان ۸۴۱۲۲۶، (بہار)۔

مطبوعات جدیدہ

اسلامی علوم کا ارتقاء عہد سلطنت کے ہندوستان میں: از پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۴۴، قیمت: ۱۲۰ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱، حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

عہد سلطنت یعنی غوریوں سے لودیوں تک کا دور، ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام و استحکام کا زمانہ ہے، قریب تین سو سال کے اس عہد سلطنت کی تاریخ معلوم و متداول ہے جس میں بادشاہوں کے عزل و نصب، جنگوں، بغاوتوں، فتوحات اور ہزیمتوں کی داستانیں مورخ کی زبان سے پیش کی جاتی رہی ہیں، تاریخ کے اس معروف رزمیہ کے بین السطور میں دینی، معاشرتی، ثقافتی اور علمی بزم آرائیوں کی تلاش اس کتاب کے فاضل مصنف کی شناخت ہے، اس سے پہلے بھی وہ فقہ و فتاوی کے تعلق سے عہد سلطنت کا جائزہ لے چکے ہیں، اس کتاب میں انہوں نے قرأت، تجوید، تفسیر جیسے علوم کے متعلق بدلائل بتایا کہ اس عہد میں علوم قرآن سے دلچسپی صرف درس و تدریس تک محدود نہ تھی، یہ تصنیف و تالیف کا بھی موضوع تھی، تفسیریں تھیں اور یہ متنوع تھیں، کہیں فقہی رنگ غالب تھا تو کہیں تصوف کی نکتہ آرائیوں کا غلبہ تھا، یہ بحث دلچسپ ہے اور بعض حیثیتوں سے بڑی معلومات افزا، اسی طرح علم حدیث کے متعلق بحث ہے یہ اس لیے اور بھی مفید ہے کہ اس میں اس عام اور راسخ خیال کا رد آ گیا ہے کہ عہد سلطنت میں علم حدیث پر توجہ کم کی گئی، بس چند ثانوی درجہ کی کتابیں تھیں، ثابت کیا گیا کہ علماء صرف مشارق الانوار اور مشکوۃ تک محدود نہیں تھے، صحاح ستہ خصوصاً صحیحین علماء کے درس و مطالعہ میں تھیں، ان کے نسخوں کی نقلیں تیار کی جاتیں اور ان کو تحفۃً قدردانوں کو پیش کیا جاتا، حواشی و شروح، منتخب مجموعے اور اصول حدیث کے مباحث پر بھی رسالے تیار ہوئے، یہ اس کتاب کی سب سے اہم اور قیمتی بحث ہے، فقہ میں عہد سلطنت کی کاوشوں کا ذکر تو مشہور ہی ہے، علماء و فقہاء کے ساتھ سلاطین و امراء جس طرح علم فقہ سے شغل و شغف رکھتے تھے اس کا ذکر ایک نئے انداز اور نئے معلومات کے ساتھ ہے، یقیناً دقت نظر اور ژرف نگاہی نے عظمت رفتہ کے نئے گوشے روشن کیے ہیں، اسلامی ہند کی

علمی وثقافتی تاریخ کے شائقین کے لیے اس کتاب میں بہت کچھ ہے۔

قاضی ثناءاللہ پانی پتی اور تفسیر مظہری کا تعارف: از ڈاکٹر رضوان الدین خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۵۶، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: یونیورسل بک ہاؤس، ۳-عبدالقادر مارکیٹ (شمشاد مارکیٹ) علی گڑھ۔

قاضی ثناءاللہ پانی پتی، اٹھارہویں صدی عیسوی کے ان علماء کی صف میں شامل ہیں جن کی وجہ سے کم از کم دلی اور اس کے اطراف کی سرزمین رشک آسمان بنی ہوئی تھی، حالات دگرگوں ضرور تھے کہ ایک طرف شاہ ولی اللہ کا شجرہ طیبہ، پوری طرح سایہ وثمر فگن تھا تو دوسری طرف مغل حکومت کا یہ پایہ تخت، سیاسی وفوجی لحاظ سے کمزور سے کمزور ہوتا جارہا تھا لیکن ایسے حالات میں بھی شیخ محمد عابد سنامی اور مرزا مظہر جان جاناں شہید، عبادت وریاضت کے ساتھ علم وادب کی ہمہ وقت تبلیغ ترویج میں مصروف تھے، قاضی ثناءاللہ پانی پتی ان علماء ومشائخ سے اکتساب فیض کی بہترین مثال بنے، بیسیوں رسالے اور کتابیں تالیف کیں، لیکن جس خدمت نے ان کو شہرت کی خلعت دوام عطا کی وہ ان کی تفسیر مظہری ہے، عربی زبان میں اس تفسیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ایسی معرکہ آرا تفسیر ہے جو دیگر تمام تفسیروں سے بے نیاز کردینے والی خوبی رکھتی ہے، ایسی تفسیر اور ایسے مفسر کے بارے میں بقول مصنف اب تک کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی، یہ کتاب اسی کمی کی تلافی ہے اور بڑی اطمینان بخش تلافی ہے، اس میں قاضی صاحب کے سوانح، وطن، خاندان، اساتذہ اور ماحول پر مستند مآخذ کی مدد سے سے معلومات یکجا کیے گئے، قاضی صاحب کے تمام علمی سرمایہ کے جامع تعارف کے بعد اصل موضوع یعنی تفسیر مظہری پر مبسوط بحث کی گئی، خاص طور پر بعض آیات اور مقامات کا خلاصہ جس طرح پیش کیا گیا اس سے کتاب کی نافعیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے، مصنف کی محنت اور دیدہ ریزی کا اندازہ صرف مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے، محدود سطروں میں کتاب کی تمام خوبیاں آ ہی نہیں سکتیں۔

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-**استشہاد**: ڈاکٹر راہی فدائی، کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور۔ قیمت: درج نہیں

۲-**اکمل التاریخ**: مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی، ترتیب جدید، اسید الحق قادری بدایونی، تاج الفحول اکیڈمی، مدرسہ قادریہ، مولوی محلّہ، بدایوں۔ قیمت: درج نہیں

۳-**تذکرہ علمائے امرتسر**: حکیم محمد موسیٰ امرت سری، ترتیب محمد کاشف رضا، مکتبہ فیضان، مدینہ، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد۔ قیمت: ۲۴۰ روپے

۴-**تلخیص بحر الفصاحت**: مولفہ مولوی نجم الغنی نجمی رام پوری، تلخیص کار، عارف حسن، ادارہ زبان وادب، اے۔۱۰۵ جگر کالونی، مراد آباد۔ قیمت: ۴۰۰ روپے

۵-**خطوط غالب کے ادبی مباحث**: ڈاکٹر مشیر احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۳۷۵ روپے

۶-**فخر کرناٹک شخصیات**: محمد خورشید عالم ندوی، کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

۷-**فکر بیدل**: مشتاق احمد بیدل مئو، جمال پور، مئوناتھ بھنجن، مئو۔ قیمت: ۳۵۰ روپے

۸-**ماہنامہ معارف (شذرات صباح الدین عبدالرحمٰن)**: ڈاکٹر مہ جبین زیدی، منزل اکیڈمی، کراچی، ۲-بی-۱۱، کمرشل ایریا، ناظم آباد نمبر ۲، کراچی۔ قیمت: ۳۵۰ روپے

۹-**معراج العروض**: عارف حسن خان، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

۱۰-**معروضات عروض وقافیہ**: عارف حسن خان، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

۱۱-**مہبط انوار**: ڈاکٹر راہی فدائی، الانصار پبلیکیشنز، ریاست نگر، حیدر آباد۔ قیمت: ۲۰۰ روپے